ناصر کاظمی
مُنیر نیازی
سَاقی فاروقی
کشور ناھید
رات کے مُسَافر
ترتیب انور سجّاد

رات کے مسافر
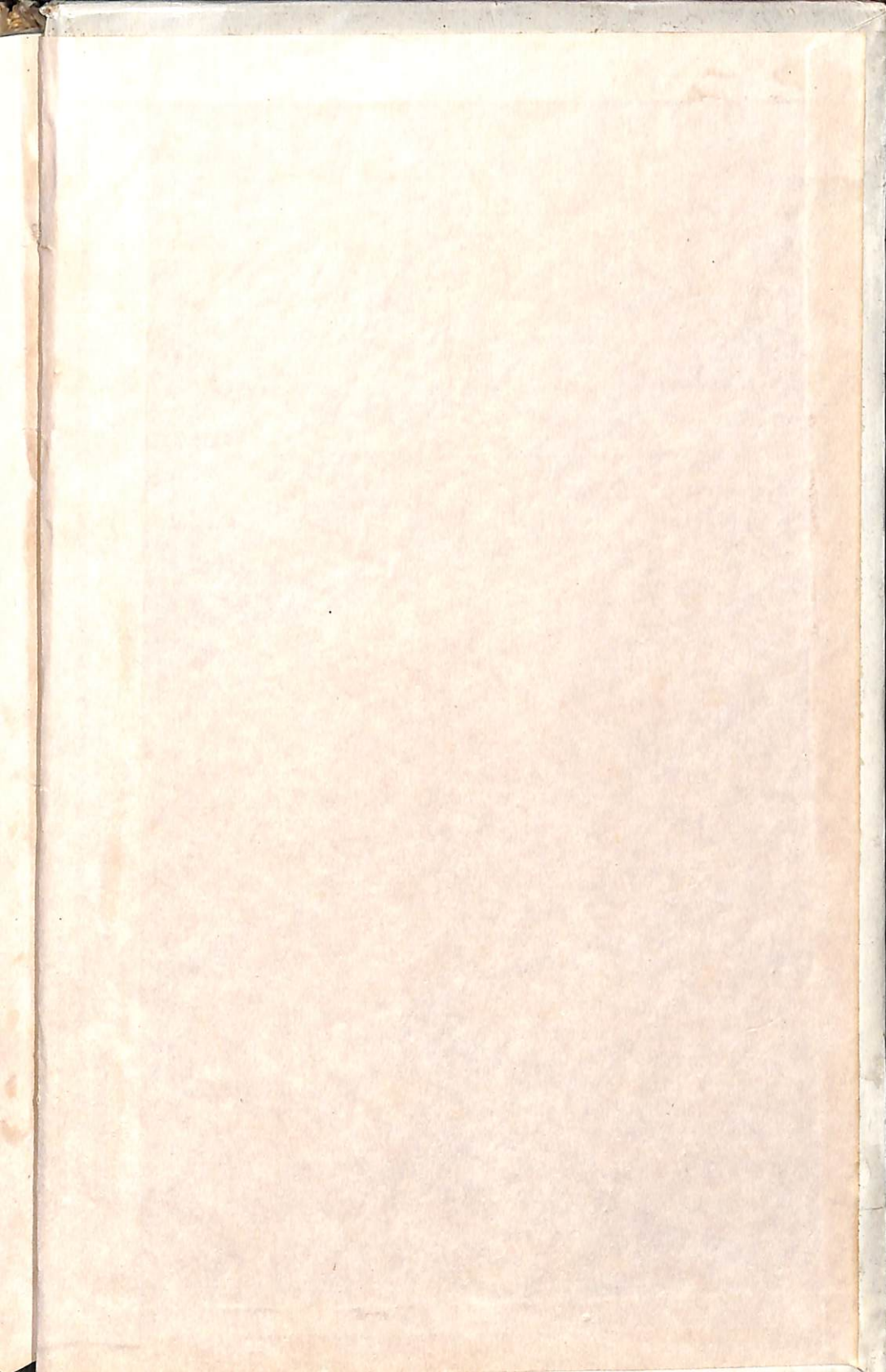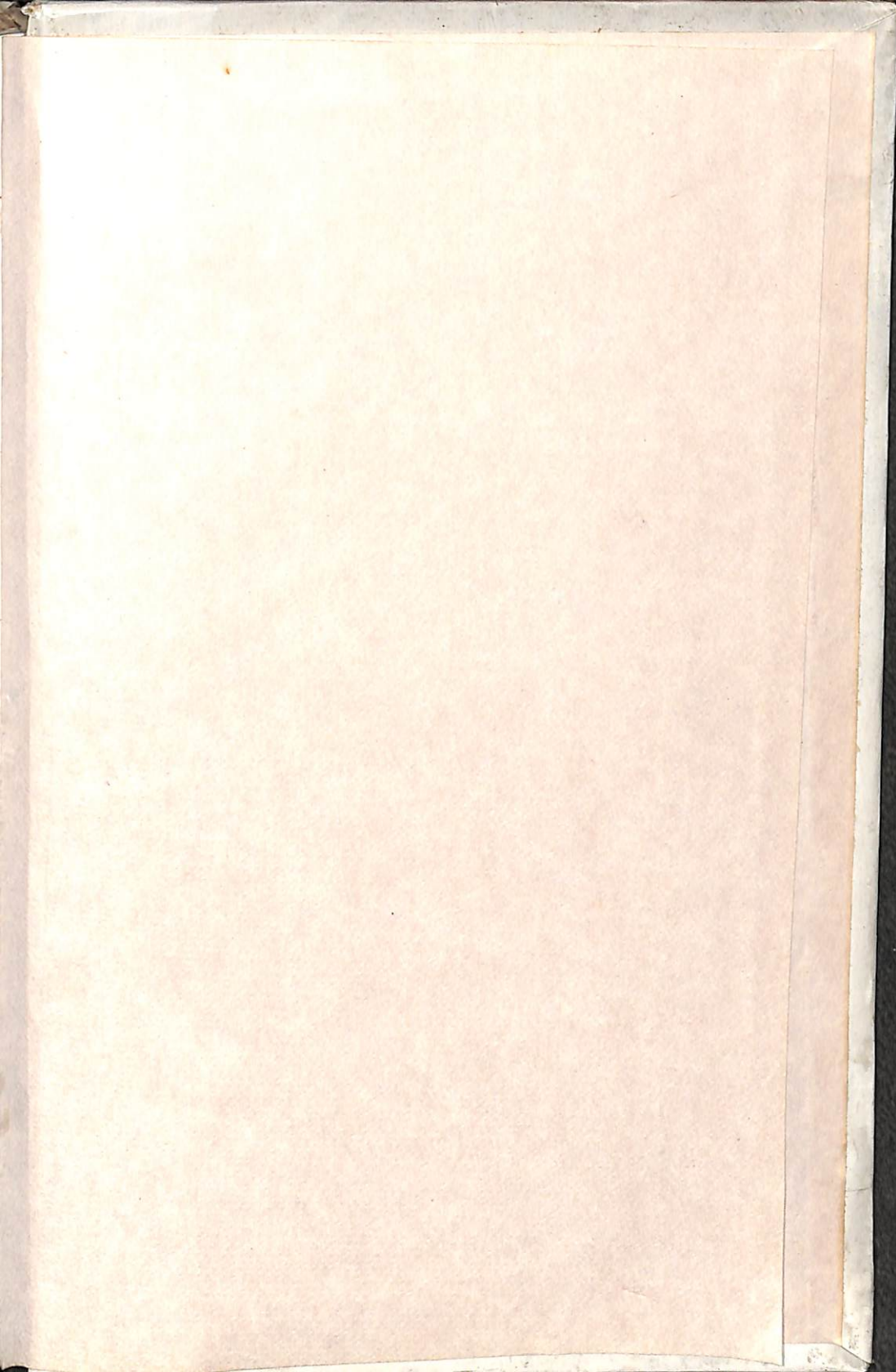
ناصر کاظمی
منیر نیازی
ساقی فاروقی
کشور ناہید

ہمارے عہد کے شاعر: پہلی پہچان

ترتیب:

انور سجاد

نئی آواز، جامعہ نگر نئی دہلی

خوشنویس: جمال گیاوی

تزئین: صادق

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار: نومبر ۱۹۸۶ء

تعداد 750

قیمت: =/28

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

داستان

○

سَفَر : انورسجاد : پانچ

○

پہلا مسافر : ناصر کاظمی : اکیلے گھر، بند دروازے اور راہگیروں سے خالی راہگزاریں
تعارف و انتخاب : سہیل احمد
سات

○

دوسرا مسافر : منیر نیازی : طلسمی اور گنجان رستے
تعارف و انتخاب : محمد سلیم الرحمٰن
اکیاون

○

تیسرا مسافر : ساقی فاروقی : رادار
تعارف و انتخاب : شمیم حنفی
اُنہتّر

○

چوتھا مسافر : کشور ناھید : اب اور مکھوٹے نہیں . . .
تعارف و انتخاب : شمیم حنفی
ترانوے

کردار

مسافر: ناصر کاظمی، منیر نیازی، ساقی فاروقی، کشور ناہید

رفیق: سہیل احمد، محمد سلیم الرحمن، شمیم حنفی

ہم سفر: انور سجاد، صادق

سفر

سفر ہر عہد کے انسان کی تقدیر بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی۔ جانی پہچانی اور سمجھی بوجھی منزلوں سے لے کر بے نشان اور انجانی منزلوں تک، اس سفر کی کہانی کے سلسلے چاروں دشاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک اور دشا انسان کا باطن ہے —— تجربے اور تلاش کی پانچویں سمت جس کی تلاش کا بوجھ ہر عہد کے فن کار کی تیسری آنکھ اٹھائے پھرتی ہے۔ وہ آنکھ جو بند پلکوں میں بھی جاگتی رہتی ہے اور سوچتی رہتی ہے۔ اس تلاش کا دائرہ بیتے دنوں سے لے کر آنے والے دنوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ کل اور آج اور آنے والا کل تخلیقی بصیرت اور حواس کی سرگرمی کے تین الگ الگ منطقے بھی ہیں اور ان سے مل جل کر وجود میں آنے والی ایک ناقابلِ تقسیم اکائی بھی۔ حال کی حدوں کو ناپنے کی کوشش جگوں سے جاری ہے اور آگے بھی جاری رہے گی۔ اس کی کوکھ انسان کی تجربی اور قیاسی کائنات سے کہیں زیادہ کشادہ اور گہری ہے۔

یہ چار مسافر اسی بے حد و حساب کائنات کے تماشائی ہیں، تماشائی ہی نہیں قیدی بھی ہیں۔ اس سفر سے مفر کی کوئی صورت ان کا نصیب نہیں۔ ان کا ارادہ بھی نہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو ایک محفوظ حسی اور جذباتی زندگی کی دریافت اب ایسی الجھن بھی نہیں کہ جس کا کوئی حل نہ ہو۔ مگر ایک فرق جو ان کے سفر کو ان کے پیش رووں کے سفر سے الگ کرتا ہے، یہ ہے کہ گئے زمانوں میں دن جاگنے کے لیے ہوتے تھے، رات سونے کے لیے؛ یا پھر سورج کی پہلی کرن سے آخری کرن تک کی جستجو کا حساب کرنے کے لیے۔ ان کے تجربوں کی بساط پر دن اور رات کا بھید مٹ گیا ہے۔

اب ایک انتھک، کبھی نہ ختم ہونے والی جاترا کے مرحلے ہیں اور ایک لمبی کالی رات۔ سورج، چاند، ستارے، سبھی اس رات کے دامن میں گم ہو چکے ہیں۔ اندھیرے کی پرتوں میں ان کا سراغ پانا مشکل، آگے جانا مشکل۔ مگر یہ چاہیں بھی تو ٹھہر نہیں سکتے۔ پرانے ضابطے، قوانین، عقیدے، تصورات، نظریے اور روایتیں جو آپ اپنا سہارا نہ بن سکیں، بے نشان منزلوں کے اور گھنی اندھی تاریکیوں میں الجھے ہوئے کسی مسافر کو کیا سہارا دے سکیں گی؟ وقت کی زنبیل میں اس سوال کا کوئی بندھا ٹکا، معین اور شافی جواب موجود نہیں ہے۔

مذہبی، سیاسی، ذہنی، جذباتی اور مادی استحصال —— تجربوں کی مالائیں پروئے ہوئے ان گنت سوال، ماضی بھی حال، مستقبل بھی حال۔ جبھی تو ان مسافروں میں کوئی کھنڈروں اور برجوں اور ویرانوں میں بھٹکتا ہے اور کوئی اداس اداس پھرتا ہے کہ رفتگاں کا سراغ ملے تو ان کے واسطے سے آپ اپنی پہچان کا بھی سرا ہاتھ آئے۔ آنکھوں کے رادار پر کسی کو صرف تاریک پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں اور کوئی موجِ مضطرب طلب کے کانٹوں بھرے جنگل میں پھولوں کا پتہ پوچھتی پھرتی ہے۔

ناصر کاظمی، منیر نیازی، ساقی فاروقی اور کشور ناہید اس عہدِ حرماں میں تلاش کے چار استعارے بھی ہیں اور ہمارے تخلیقی ماحول کے ہجوم بے چہرگاں سے الگ چار مانوس صورتیں بھی۔ ان کی تلاش کے زاویے اور سفر کے راستے بہ ظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن وہ بے مہر و بے کنار رات جس نے ان کے شعور کی حصار بندی کی ہے، ان چاروں کا مشترکہ تجربہ ہے۔ ان مسافروں میں ایک مانوس اجنبی، جو گئے دنوں کا سراغ لے کر آیا تھا، کہیں دور جا بسا۔ مگر اس کے لفظوں نے تلاش کی وہ امانت ہم تک پہنچائی ہے جو تا حال تمام نہیں ہوئی۔ ناصر کاظمی کے بعد، اور منیر نیازی، ساقی فاروقی، کشور ناہید کے علاوہ، تلاش کا یہ سفر اور بھی کئی قدموں کی گونج سے آباد ہے۔ ان کی یہ دستاویز اس سلسلے کے آئندہ انتخابات ہیں۔

—— انور سجاد

اکیلے گھر، بند دروازے

اور

راہگیروں سے خالی راہگزاریں

○

ناصر کاظمی کی غزلوں کا انتخاب

○

تعارف و انتخاب:

سہیل احمد
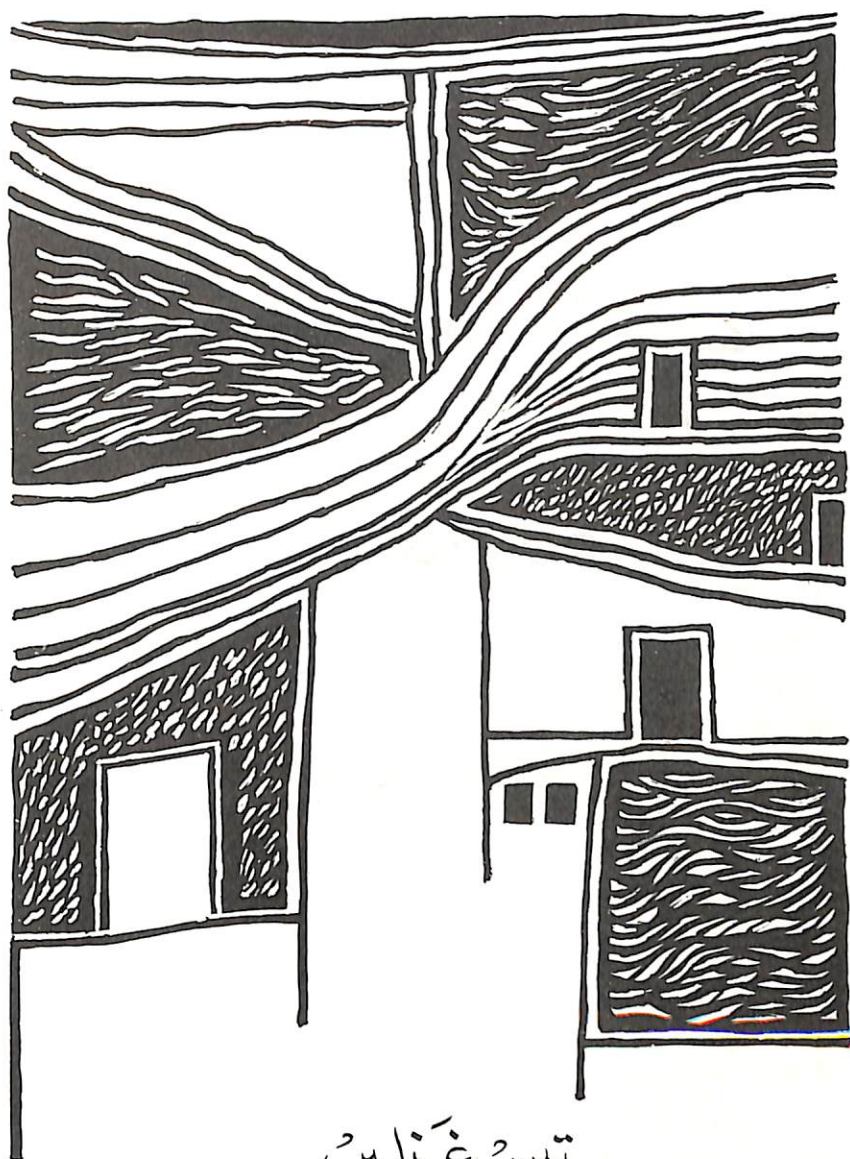
تیس غزلیں

○

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر کاظمی کا شعری سفر ایک بڑے تہذیبی آشوب کے دنوں سے شروع ہوا اور ایک دوسرے آشوب کے دنوں میں تمام ہوا۔ یوں تو ناصر کاظمی غزل پہلے بھی کہتا تھا لیکن اُس کی غزل کی پہچان، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد ہی ہوئی۔ اسی طرح اُس کی آخری عُمر کی غزلوں میں کئی رویّے تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن ناصر کے شعری سفر کا اختتام، طوفانی رات میں بچھڑنے والوں اور جلی ہوئی عمارتوں کے تذکرے پر ہوا جن کے پس منظر میں مشرقی پاکستان میں ہونے والی المناک اور دہشت انگیز واردات موجود تھی۔

یوں اگر دیکھیں تو ناصر کی ابتدائی شاعری ایک بڑے طوفان کے بعد کی کیفیت سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس شاعری میں آشوب کے دنوں کی کتھا ہے، شکست و ریخت کا ذکر ہے، "رفتگاں" کی تلاش ہے اور "خالی ہونے والی بستیوں" کی کہانی ہے۔ آخری دنوں کی غزلوں میں ایک بار پھر بڑا آشوب سامنے ہے، ایک بار پھر گم ہونے والے لوگوں کا ذکر ہے اور پھر قتل و غارت کے پس منظر میں درماندہ لوگوں کے گروہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح ناصر کی ابتدائی غزلوں کے "رفتگاں" اور آخری غزلوں کے "بچھڑ جانے والے" اس کی شاعری کے اوّل و آخر کو ایک تکمیلی وحدت دے دیتے ہیں اور اس شاعری کے اوّلیں اور تکمیلی نقطوں کے درمیان تہذیبی آشوب کی پوری داستان پھیلی ہوئی ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات نے ہمارے ادب کو جس طرح متاثر کیا اُس کے تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں۔ اُس عہد کے مروّج ادبی رویّوں میں ایک طرف نعرے بازی اور سستی جذباتیت تھی، دوسری طرف منٹو تھے جن کی معروضیت نے ایسے گمبھیر طنز کی شکل اختیار کی تھی جس کا تاثر نعروں سے کہیں زیادہ دیرپا تھا۔ ناصر کی شخصیت میں منٹو کی طرح کی معروضیت کی گنجایش نہ تھی مگر اُس نے اپنی اُداسی کو سستی جذباتیت نہیں بننے دیا۔ ناصر کی اُداسی ایک عظیم تہذیبی آشوب سے پیدا ہوئی تھی۔ "ہجرت" کے سیاسی نتائج کی تفصیل علیحدہ موضوع ہے لیکن اس کا تہذیبی اثر پورے برِصغیر پر یہ پڑا کہ انسانی رشتوں کی مجموعی شکل ہی تبدیل ہو گئی۔ "خاندان" اور "دوستی" کے تصوّرات یکسر تبدیل ہو کر رہ گئے۔ ناصر جب "رفتگاں" کا ذکر کرتا ہے یا "خالی ہونے والی بستیوں" کو یاد کرتا ہے تو وہ تہذیب کی ایک خاص وضع کے گم ہونے کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس پورے بیان کا یہ مطلب نہیں کہ ناصر کی غزل میں واقعیت کا اکہرا اسلوب ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دَور گزرنے کے ساتھ ہی اس کی معنویت کمزور پڑ جاتی۔ ناصر کا کمال یہ ہے کہ اُس نے تہذیبی آشوب کو فطرت کے مظاہر کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ کام اُردو غزل میں پہلے بھی ہوا ہے اور ناصر کی غزل کے مقابلے میں بے حد وسیع سطح پر بھی ہوا ہے لیکن اپنے عہد میں اس چیز کو اپنی شاعرانہ صناعی کا مستقل عنصر پہلے پہل ناصر ہی نے بنایا ہے اور اپنے بیان میں عجیب دل گداز کیفیت پیدا کی ہے۔ ناصر کی ابتدائی غزلوں میں فطرت کے مظاہر کی کیفیت کچھ یوں ہے جیسے کسی قافلے نے تھوڑی دیر کے لیے پڑاو ڈالا ہو، اپنی ہجرت کو فطرت کے بعض مظاہر کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے ساتھ ملا کر جدید اُردو غزل کو ایک نئی معنوی جہت عطا کی ہو۔ ناصر کی ابتدائی غزل گوئی کے آس پاس لکھی جانے والی ان نظموں اور غزلوں کو ذہن میں رکھیں جہاں فطرت عموماً اپنی ظاہری سطح سے اوپر نہیں اُٹھتی۔ شاعر فطرت کو دیکھتا ہے اور کبھی خوش اور کبھی غمگین ہو جاتا ہے۔ فطرت کا کوئی گہرا تہذیبی مفہوم نظر نہیں آتا۔ اس تناظر میں ناصر کی غزل کی مذکورہ بالا صفت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ ناصر نے فطرت کا ادراک تہذیبی اُجاڑپن کے پس منظر میں کیا اور شاخوں پر جلے ہوئے بسیرے اور ہجرت کرتے ہوئے طیور دیکھے ——— ناصر کو اس جہت پر خود بھی اصرار تھا۔ اس دَور کے شعروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس جہت کو بار بار نمایاں

کرتا تھا۔ ایک بار پاک ٹی ہاؤس میں ناصر نے احمد مشتاق کا یہ شعر پڑھا تھا :

خالی شاخیں بُلا رہی ہیں
پھولو، آؤ کہاں گئے ہو

اور ملول لہجے میں کہا تھا : " یہ شعر اُن ماؤں کا نوحہ ہے جن کی گودیں خالی ہو گئی ہیں " ناصر کی غزل کے پتے، پھول اور درخت بھی تہذیبی معنویت رکھتے ہیں۔ اس تہذیبی آشوب سے پار جانے کے لیے بھی اُس نے فطرت سے مدد لی ہے اور " چاند " اور " گل " کی تمثالوں سے اپنی غزلوں میں خنک چاندنی کی سی کیفیت پیدا کی ہے۔ ایک خاص دور میں ناصر نے فطرت کو اس طرح بھی پیش کیا کہ فطرت کی ظاہری سطح، تہذیبی سطح پر غالب آتی دکھائی دینے لگی۔ یہ شعر شاید اُن شعروں کے مقابلے میں کمزور ہیں جہاں فطرت تہذیب کی ترجمان بنتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ناصر کے بہت سے مقلدوں نے ناصر کی شاعری کے اسی رُخ کو نمونہ بنانے کی کوشش کی اور ان کے شعر مضحکہ خیز صورت اختیار کر گئے۔ ان لوگوں نے اسی چیز کو نظر انداز کر دیا کہ ناصر کے بہترین اشعار میں فطرت کا منظر محض منظر نہیں۔ فطرت کی محض تصویر کشی ناصر کے اُس مہذب لہجے کا بدل کیسے بن سکتی ہے جس میں ذاتی دکھ سکھ، تہذیبی طرزِ احساس اور فطرت گھل مل گئے ہیں۔ پھر ناصر کے پاس زبان و بیان کا جو شعور تھا، اُس کا جادو الگ ہے۔ ناصر کے ملنے والے اس چیز سے باخبر ہیں کہ لفظ ناصر کے لیے اچھے دوستوں کی طرح تھے۔ وہ لفظ کا احترام کرنا بھی جانتا تھا اور مختلف لفظوں کے سلسلے میں حفظِ مراتب کے اصول پر عمل کرتا تھا۔ ناصر نے ہر لفظ کو ایک " شخص " کہا ہے۔ لفظوں کی یہ تہذیب جو ناصر کی شاعری میں آباد ہے، اُس کے پس منظر میں کلاسیکی اُردو غزل کی کئی سلطنتیں آباد ہیں۔ ناصر کلاسیکی اُردو شاعری کا جیسا مزاج شناس تھا، اس کی مثال اُس کے معاصروں میں کم کم دکھائی دیتی ہے۔ شعر کی تشریح کرتے ہوئے ناصر لفظوں کی بعض ایسی جہتوں کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ شعر میں ایک نئی بُعد پیدا ہو جاتی تھی۔ ناصر تو متروک لفظوں تک کو اہمیت دیتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ متروک لفظوں کے پیچھے بعض ایسے تجربے اور ثقافتی رویّے اوجھل ہیں جو ان لفظوں کو استعمال کرنے سے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ ایسی مسرت حاصل ہو سکتی ہے جیسے کھدائی کرتے ہوئے کوئی قیمتی سکہ یا نایاب چیز ہاتھ لگ جائے۔ ناصر نے غزل میں وہی لفظ استعمال کیے ہیں جو اُس کے شعری تجربے اور تہذیبی مزاج سے ہم آہنگ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لفظوں کی انھی سطحوں کا قائل تھا۔ وہ تجربوں کی نوعیت بدلنے کے ساتھ لفظوں کی نوعیت بھی بدل دیتا تھا۔ اُس کی نظم " نشاطِ خواب " میں تجربے کی تبدیلی کے ساتھ لفظیات کی تبدیلی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اپنی منظوم کتھا " سُر کی چھایا " میں اُس نے مقامی بولی کے لفظ استعمال کر کے اپنے تجربے کی مخصوص وضع کو ایک نئی معنویت دی ہے۔

جدید دور کے اکثر شعرا نے اپنے عہد کے رُوحانی اور معاشرتی آشوب کے بیان کے لیے کسی مرکزی علامت سے مدد لی ہے۔ ایلیٹ نے " ویسٹ لینڈ " میں اپنے عہد کے آشوب کو جن ہمہ گیر تمثالوں کی مدد سے اُجاگر کیا، ان کی وجہ سے بہت سے شعرا نے خرابے، ریگ زار یا بنجر زمین کی علامتیں استعمال کیں۔ کچھ شاعروں نے اساطیری علامتوں کو جدید صورت حال پر منطبق کرنا چاہا۔ جدید اُردو شاعری میں بھی اس طرح کے طریق کار کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ منیر نیازی نے اپنے عہد کو ایک ایسے آسیبی شہر کی صورت دیکھا ہے جس کی دہشت ناک فضاؤں میں تخلیقی رویّے دم توڑ رہے ہیں۔ ناصر کاظمی کے ہاں چھوٹی چھوٹی تصویروں کو جوڑنے سے عہد کی ویرانی کی تصویر مکمل ہوتی ہے اور ایک ایسا شہر سامنے آتا ہے جس میں " اکیلے گھر "، " بند دروازے "، اور " راہگیروں سے خالی راہگزاریں " دکھائی دیتی ہیں۔ شاعر اکیلا اس بستی میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ لوگ سوتے ہیں یا بے تعلق ہیں۔ شاعر کبھی فطرت سے پناہ حاصل کرتا ہے اور کبھی اپنی تنہائی اور اُداسی کو اپنا ہمسفر بناتا ہے۔ ناصر نے جس شہر کا ادراک کیا ہے وہ کون سا شہر ہے؟ جس شہر میں ناصر زندہ تھا، اُس میں تو آبادی پھیلتی جا رہی تھی، نئی نئی تعمیریں ہو رہی تھیں۔ پھر ناصر کن سائیں سائیں کرتی بستیوں کی کہانیاں

سُنا رہا تھا؟ کیا یہ ناصر کی اپنی ذات ہے؟ کیا یہ اس معاشرے کا نوحہ ہے جس میں وہ رویّے گم ہو گئے تھے جنھیں ناصر ڈھونڈھ رہا تھا؟ باہر جلتی دھوپ ہے یا رات، لوگ ستستا رہے ہیں یا سو رہے ہیں، شاعر دھوپ میں جلتا پھر رہا ہے یا کالی راتوں میں جاگ رہا ہے! کوئی کھڑکی کھلی نظر آتی ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے بے تعلق ماحول میں تبدیلی آئی ہے اور مفاہمت اور اُمید کا کوئی نیا امکان سامنے آیا ہے لیکن پھر وہی خاموشی منظر پر چھا جاتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ صورتِ حال حکایاتی ماحول سے مماثلت رکھتی ہے جس میں سُنسان خالی شہر اور بند دروازے اپنی مخصوص معنویت رکھتے ہیں لیکن ناصر جانتا تھا کہ زرمیے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ یوں اپنی نجی گفتگو میں اُس نے اپنی شجاعت اور شیر کے شکار کے چاہے جتنے بھی قصّے سُنائے ہوں، شاعری میں وہ حکایتوں کا ہیرو نہیں تھا۔ اس نے اپنے عہد کی ویرانی کو دیکھا اور اپنی اُداسی کو متقدس بنا لیا۔ اُداسی کو اس نے آج کے انسان کا بھجن کہا، اس لیے کہ اُداسی زرپرست معاشرے کی حرص سے علیحدہ ہونے کی کوشش تھی۔ معاشرے کی اس کیفیت سے ناصر آخری سالوں میں جھنجھلا سا بھی گیا۔ اُس نے کاروباری معاشرے کے رویّوں پر براہِ راست چوٹیں بھی کیں۔ اُس کے لہجے میں تلخی آئی۔ اِن شعروں کی ناصر کے فن کے مجموعی تناظر میں ایک خاص اہمیت ہے۔ لیکن شاید ناصر کا یہ میدان نہیں تھا۔ اُس کا حقیقی لہجہ غنائیت کے عناصر سے مملو ہے اور اُس میں واقعیت براہِ راست نہیں آتی بلکہ ایک مترفع انداز میں فنکارانہ تقلیب کے عمل سے گزر کر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ناصر نے خود یہ مثال دے رکھی ہے کہ آپ عطر کی شیشی کو کھولیں تو آپ کو خوشبو تو آئے گی مگر اُس میں نہ پھول نظر آئیں گے نہ باغ ——— ناصر کی شاعری بھی عطر کی شیشی ہے جس میں اپنے عہد کا جوہر موجود ہے۔ اس میں واقعیت اسی طرح کی فنکارانہ تبدیلیوں کے بعد آتی ہے۔ ناصر کی تمثالوں اور اُس کے استعاروں سے آپ کو اپنے عصر کی خوشبو آئے گی، پھول یا باغ دکھائی نہیں دیں گے۔ ناصر کے بعد شاعروں کی ایک مطمئن اور ہنسوڑ نسل بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ ان کے اطمینان یا اُن کی ہنسی پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا اُن کی ہنسی میں کوئی تہذیب بول رہی ہے؟ ناصر نے تو اپنی اُداسی کو ایک پوری تہذیب کی آواز بنا دیا ہے۔ کیا ان شاعروں نے اپنی ہنسی یا اطمینان کو کوئی ایسی شکل دی؟ ناصر کی اُداسی آج بھی یہ سوال پوچھ رہی ہے!

مکتبہ جامعہ کے لیے ناصر کاظمی کی غزلوں کا یہ انتخاب "برگِ نے" اور "دیوان" کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ناصر کاظمی کی غزل کے بنیادی رویے اور مختلف رنگ اس انتخاب میں جگہ پا جائیں۔

"برگِ نے" اور "دیوان" کے علاوہ ناصر کی غزلوں کا ایک اور مجموعہ "پہلی بارش" ہے لیکن یہ غزلوں کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ اس لیے اس مجموعے کی ایک دو غزلوں کے چناؤ سے اس کا مجموعی تاثر سامنے نہیں آسکتا ——— ناصر کی بعض نظمیں بھی اہم ہیں اور اس کے مجموعے "نشاطِ خواب" میں شامل ہیں۔ ناصر کی منظوم کتھا "سُر کی چھایا" جو "سویرا" میں شائع ہوئی تھی، ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی ہے ——— "پہلی بارش" کی غزلوں، "نشاطِ خواب" کی منظومات اور "سُر کی چھایا" کو اس انتخاب کے دائرے سے باہر سمجھا گیا ہے۔

○

ایسا بھی کوئی سپنا جاگے
ساتھ مرے اک دُنیا جاگے

وہ جاگے جسے نیند نہ آئے
یا کوئی میرے جیسا جاگے

ہوا چلے تو جاگے جنگل
ناؤ چلے تو ندیا جاگے

راتوں میں یہ رات امر ہے
کل جاگے تو پھر کیا جاگے

داتا کی نگری میں ناصر
مَیں جاگوں یا داتا جاگے

□□

○

مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے
مگر جینے کی صورت تو رہی ہے

مَیں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

چلے دل سے اُمیدوں کے مسافر
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے

نہ سمجھو تم اسے شورِ بہاراں
خزاں پتّوں میں چھپ کے رو رہی ہے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

□□

○

کون اس راہ سے گزرتا ہے
دل یونہی انتظار کرتا ہے

دیکھ کر بھی نہ دیکھنے والے
دل تجھے دیکھ دیکھ ڈرتا ہے

شہرِ گُل میں کٹی ہے ساری رات
دیکھیے دن کہاں گزرتا ہے

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

○

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اِس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

□□

○

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اُتر نہ جائے کہیں

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

نہ ملا کر اُداس لوگوں سے
حُسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں

آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں

آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصرؔ
پھر یہ دریا اُتر نہ جائے کہیں

□□

○

وہ دلنواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لیے کوئی شایانِ التماس نہیں

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

کبھی کبھی جو ترے قُرب میں گزارے تھے
اب اُن دنوں کا تصوّر بھی میرے پاس نہیں

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مِٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اُداس نہیں

□□

چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو
دل کی افسردگی کچھ کم تو ہوئی ہم نفسو شکر کرو

آؤ پھر یادِ عزیزاں ہی سے میخانۂ جاں گرم کریں
دیر کے بعد یہ محفل تو جمی ہم نفسو شکر کرو

آج پھر دیر کی سوئی ہوئی ندی میں نئی لہر آئی
دیر کے بعد کوئی ناؤ چلی ہم نفسو شکر کرو

رات بھر شہر میں بجلی سی چمکتی رہی ہم سوئے رہے
وہ تو کہیے کہ بلا سر سے ٹلی ہم نفسو شکر کرو

درد کی شاخِ تہی کاسہ میں اشکوں کے نئے پھول کھلے
دل جلی شام نے پھر مانگ بھری ہم نفسو شکر کرو

آسماں لالۂ خونیں کی نواؤں سے جگر چاک ہوا
قصرِ بیداد کی دیوار گری ہم نفسو شکر کرو

○

ترے ملنے کو بےکل ہو گئے ہیں
مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں

یہاں تک بڑھ گئے آلامِ ہستی
کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں

کہاں تک تاب لائے ناتواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں

نگاہِ یاس کو نیند آ رہی ہے
مژہ پر اشک بوجھل ہو گئے ہیں

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

○

لبِ معجز بیاں نے چھین لیا
دل کا شعلہ زباں نے چھین لیا

دل مرا شب چراغ تھا جس کو
مژۂ خوں فشاں نے چھین لیا

عمر بھر کی مسرتوں کا خمار
خلشِ ناگہاں نے چھین لیا

تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

آ کے منزل پہ آنکھ بھر آئے
سب مزہ رفتگاں نے چھین لیا

ہر گھڑی آسماں کو تکتا ہوں
جیسے کچھ آسماں نے چھین لیا

باغ سنسان ہو گیا ناصر
آج وہ گل خزاں نے چھین لیا

▱▱

○

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

□□

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

جدائیوں کے زخم دردِ زندگی نے بھر دیے
تجھے بھی نیند آگئی مجھے بھی صبر آگیا

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انھیں کہ آسمان کھا گیا

یہ صبح کی سفیدیاں یہ دوپہر کی زردیاں
اب آئینے میں دیکھتا ہوں میں کہاں چلا گیا

یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آگئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آگیا

○

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

تیرے کرم سے اے المِ حُسن آفریں
دل بن گیا ہے دوست کی خلوت کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گذری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمھارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

□□

○

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گُل اُداس کر کے مجھے

مَیں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

مَیں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اُڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے اُبھر اُبھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عُمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اَے غمِ دُنیا
بُلا رہا ہے کوئی بام سے اُتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سُنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

یہ کہہ رہا ہے دیارِ طرب کا نظارا
یہیں سے ملے گا مجھے میرا انجمن آرا

خیالِ حُسن میں کتنا بہار پرور ہے
شبِ خزاں کی خنک چاندنی کا نظارا

چلے تو ہیں جرسِ گُل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

چلو کہ برف پگھلنے کی صُبح آ پہنچی
خبر بہار کی لایا ہے کوئی گُل پارا

چلے چلو انھی گمنام برف زاروں میں
عجب نہیں یہیں مِل جائے درد کا چارا

کسے مجال کہ رُک جائے سانس لینے کو
رواں دواں لیے جاتا ہے وقت کا دھارا

بگولے یوں اُڑے پھرتے ہیں خشک جنگل میں
تلاشِ آب میں جیسے غزالِ آوارہ

ہمیں وہ برگِ خزاں دیدہ ہیں جنھیں ناصر
چمن میں ڈھونڈھتی پھرتی ہے بوئے آوارہ

○

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں!
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

مَیں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

یہ کون لوگ ہیں مرے اِدھر اُدھر
وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے

وہ دل میں کھُبنے والی آنکھیں کیا ہُوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے

عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دِیا جلانے والے کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا!
زمیں کا بوجھ اُٹھانے والے کیا ہوئے

□□

○

دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر
لگی ہے آگ کہیں رات سے کنارے پر

یہ کالے کوس کی پُر ہول رات ہے ساتھی
کہیں اماں نہ ملے گی تجھے کنارے پر

صدائیں آتی ہیں اُجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر

یہاں تک آئے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے
وہ رن پڑا ہے کہیں دوسرے کنارے پر

یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر

اس انقلاب کی شاید خبر نہ تھی اُن کو
جو ناؤ باندھ کے سوتے رہے کنارے پر

ہیں گھات میں ابھی کچھ قافلے لٹیروں کے
ابھی جمائے رہو مورچے کنارے پر

بچھڑ گئے تھے جو طوفاں کی رات میں ناصر
سُنا ہے اُن میں سے کچھ آ ملے کنارے پر

▱▱

○

اپنی دُھن میں رہتا ہوں
مَیں بھی تیرے جیسا ہوں

او پچھلی رُت کے ساتھی
اب کے برس مَیں تنہا ہوں

تیری گلی میں سارا دن
دُکھ کے کنکر چنتا ہوں

مجھ سے آنکھ ملائے کون
مَیں تیرا آئینہ ہوں

میرا دیا جلائے کون
میں ترا خالی کمرہ ہوں

ترے سوا مجھے پہنے کون
مَیں ترے تن کا کپڑا ہوں

تو جیون کی بھری گلی
مَیں جنگل کا رستہ ہوں

آتی رُت مجھے روئے گی
جاتی رُت کا جھونکا ہوں

اپنی لہر ہے اپنا روگ
دریا ہوں اور پیاسا ہوں

▱▱

○

دل میں اک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دُنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو ابھی سے اُٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

○

رقم کریں گے ترا نام انتسابوں میں
کہ انتخابِ سخن ہے یہ انتخابوں میں

مری بھری ہوئی آنکھوں کو چشمِ کم سے نہ دیکھ
کہ آسمان مقید ہیں ان حبابوں میں

ہر آن دل سے اُلجھتے ہیں دو جہان کے غم
گھرا ہے ایک کبوتر کئی عقابوں میں

ذرا سنو تو سہی کان دھر کے نالۂ دل
یہ داستاں نہ ملے گی تمھیں کتابوں میں

نئی بہار دِکھاتے ہیں داغِ دل ہر روز
یہی تو وصف ہے اس باغ کے گلابوں میں

پون چلی تو گُل و برگ دَف بجانے لگے
اُداس خوشبوئیں لَو دے اُٹھیں نقابوں میں

ہوا چلی تو کھلے بادبانِ طبعِ رسا
سفینے چلنے لگے یاد کے سرابوں میں

کچھ اس ادا سے اُڑا جا رہا ہے ابلقِ رنگ
صبا کے پاؤں ٹھہرتے نہیں رکابوں میں

بدلتا وقت یہ کہتا ہے ہر گھڑی ناصر
کہ یادگار ہے یہ وقت انقلابوں میں

○

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشئ آواز نما کچھ کہتی ہے

سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوتے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

جب صبح کو چڑیاں باری باری بولتی ہیں
کوئی نامانوس اداس نوا کچھ کہتی ہے

جب رات کو تارے باری باری جاگتے ہیں
کئی ڈوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے

کبھی بھور بھئے کبھی شام پڑے کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رت کی ہوا کچھ کہتی ہے

مہمان ہیں ہم مہمان سرا ہے یہ نگری
مہمانوں کو مہمان سرا کچھ کہتی ہے

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو
اے ہم سفرو آوازِ درا کچھ کہتی ہے

ناصر آشوبِ زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

□□

○

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اوّلیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارا تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا اُلجھا ہوں غمِ دُنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصرؔ
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

▱▱

کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے
وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جائے

مری بربادیوں پر رونے والے
تجھے محوِ فغاں دیکھا نہ جائے

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غمِ صد کارواں دیکھا نہ جائے

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار
بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

در و دیوار ویراں، شمع مدھم
شبِ غم کا سماں دیکھا نہ جائے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

بھری برسات خالی جا رہی ہے
سرِ ابرِ رواں دیکھا نہ جائے

کہیں تم اور کہیں ہم، کیا غضب ہے
فراقِ جسم و جاں دیکھا نہ جائے

وہی جو حاصلِ ہستی ہے ناصر
اسی کو مہرباں دیکھا نہ جائے

○

آرائشِ خیال بھی ہو، دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اِس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طلسم
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

دیوانگیِ شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

جز دل کوئی مکان نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ رہے در کھلا بھی ہو

ہر ذرہ ایک محملِ عبرت ہے دشت کا
لیکن کسے دکھاؤں کوئی دیکھتا بھی ہو

ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت
لیکن کسے سناؤں کوئی ہم نوا بھی ہو

فرصت میں سن شگفتگیِ غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو

بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو تو ہمیں دیکھتا بھی ہو

بزمِ سخن بھی ہو سخنِ گرم کے لیے
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

○

گا رہا تھا کوئی درختوں میں
رات نیند آگئی درختوں میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے
آگ سی لگ گئی درختوں میں

مینہہ جو برسا تو برگ ریزوں نے
چھیڑ دی بانسری درختوں میں

یہ ہوا تھی کہ دھیان کا جھونکا
کس نے آواز دی درختوں میں

ہم اِدھر گھر میں ہو گئے بے چین
دور آندھی چلی درختوں میں

لیے جاتی ہے موسموں کی پکار
اجنبی اجنبی درختوں میں

کتنی آبادیاں ہیں شہر سے دُور
جا کے دیکھو کبھی درختوں میں

نیلے، پیلے، سفید، لال، ہرے
رنگ دیکھے سبھی درختوں میں

خوشبوؤں کی اُداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں

دیر تک اُس کی تیز آنکھوں سے
روشنی سی رہی درختوں میں

چلتے چلتے ڈگر اُجالوں کی
جانے کیوں مُڑ گئی درختوں میں

سہمے سہمے تھے رات اہلِ چمن
تھا کوئی آدمی درختوں میں

○

نصیبِ عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں
بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں

تلافیٔ ستمِ روزگار کون کرے
تو ہم سخن بھی نہیں راز دار بھی تو نہیں

زمانہ پرسشِ غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ تیرا غم، غمِ لیل و نہار بھی تو نہیں

تری نگاہِ تغافل کو کون سمجھائے
کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار بھی تو نہیں

تو ہی بتا کہ تری خامشی کو کیا سمجھوں
تری نگاہ سے کچھ آشکار بھی تو نہیں

وفا نہیں نہ سہی رسم و راہ کیا کم ہے
تری نظر کا مگر اعتبار بھی تو نہیں

اگرچہ دل تری منزل نہ بن سکا اے دوست
مگر چراغِ سرِ رہگزار بھی تو نہیں

بہت فسردہ ہے دل، کون اس کو بہلائے
اُداس بھی تو نہیں بے قرار بھی تو نہیں

تو ہی بتا ترے بے خانماں کدھر جائیں
کہ راہ میں شجرِ سایہ دار بھی تو نہیں

فلک نے پھینک دیا برگِ گل کی چھاؤں سے دور
وہاں پڑے ہیں جہاں خارزار بھی تو نہیں

جو زندگی ہے تو بس تیرے دردمندوں کی
یہ جبر بھی تو نہیں اختیار بھی تو نہیں

وفا، ذریعۂ اظہارِ غم سہی ناصر
یہ کاروبار کوئی کاروبار بھی تو نہیں

○

رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر

بے نشاں ہے سفر رات ساری پڑی ہے مگر
آ رہی ہے صدا دم بدم صبر کر صبر کر

بیالیس

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم صبر کر صبر کر

تیرے قدموں سے جاگیں گے اُجڑے دلوں کے ختن
پا شکستہ غزالِ حرم صبر کر صبر کر

شہر اُجڑے تو کیا ہے کُشادہ زمینِ خُدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

یہ محلاتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں اِن کے عَلم صبر کر صبر کر

دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم صبر کر صبر کر

لہلہائیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں
کُھل کے برسے گا ابرِ کرم صبر کر صبر کر

کیوں پٹکتا ہے سر سنگ سے جی جلا ڈھنگ سے
دل ہی بن جائے گا خود صنم صبر کر صبر کر

پہلے کِھل جائے دل کا کنول پھر لکھیں گے غزل
کوئی دم اے صریرِ قلم صبر کر صبر کر

درد کے تار ملنے تو دے ہونٹ ہلنے تو دے
ساری باتیں کریں گے رقم صبر کر صبر کر

دیکھ ناصرؔ زمانے میں کوئی کسی کا نہیں
بھول جا اُس کے قول و قسم صبر کر صبر کر

○

ترے خیال سے لَو دے اُٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

تو کِس خیال میں ہے منزلوں کے شیدائی
انھیں بھی دیکھ جنھیں راستے میں نیند آئی

پکار اے جرسِ کاروانِ صبحِ طرب
بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں تیرے سودائی

ٹھہر گئے ہیں سرِ راہ خاک اڑانے کو
مسافروں کو نہ چھیڑ اے ہوائے صحرائی

رہِ حیات میں کچھ مرحلے تو دیکھ لیے
یہ اور بات تری آرزو نہ راس آئی

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

دلِ فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اٹھا
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی

میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

جہاں بھی تھا کوئی فتنہ تڑپ کے جاگ اٹھا
تمام ہوش تھی مستی میں تیری انگڑائی

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہرِ رعنائی

وہ تابِ درد وہ سودائے انتظار کہاں
انھی کے ساتھ گئی طاقتِ شکیبائی

پھر اُس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

○

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈھتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یونہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا دورِ آسماں بھی!
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی ستمگروں کی پلک نہ بھیگی
جو نالہ اٹھا تھا رات دل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

وہ میکدے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

○

دن ڈھلا، رات پھر آ گئی، سو رہو سو رہو
منزلوں چھا گئی خامشی، سو رہو سو رہو

سارا دن تپتے سورج کی گرمی میں جلتے رہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھر چلی، سو رہو سو رہو

گرم سنسان قریوں کی دھرتی مہکنے لگی
خاک رشکِ ارم بن گئی، سو رہو سو رہو

رزم گاہِ جہاں بن گئی جائے امن واماں
ہے یہی وقت کی راگنی، سو رہو سو رہو

کیسے سُنسان ہیں آسماں چُپ کھڑے ہیں مکاں
ہے فضا اجنبی اجنبی، سو رہو سو رہو

تھک گئے ناقہ و سارباں تھم گئے کارواں
گھنٹیوں کی صدا سو گئی، سو رہو سو رہو

چاندنی اور دھُوئیں کے سوا دُور تک کچھ نہیں
سو گئی شہر کی ہر گلی، سو رہو سو رہو

گردشِ وقت کی لوریاں رات کی رات ہیں
پھر کہاں یہ ہوا یہ نمی، سو رہو سو رہو

ساری بستی کے لوگ اس مُدھر لے میں کھوئے گئے
دُور بجنے لگی بانسری، سو رہو سو رہو

دُور شاخوں کے جُھرمٹ میں جگنو بھی گُم ہو گئے
چاند میں سو گئی چاندنی، سو رہو سو رہو

گھر کے دیوار و در راہ تک تک کے شل ہو گئے
اب نہ آئے گا شاید کوئی، سو رہو سو رہو

سُست رفتار تارے بھی آنکھیں جھپکنے لگے
غم کے مارو گھڑی دو گھڑی، سو رہو سو رہو

مُنہ اندھیرے ہی ناصرؔ کسے ڈھونڈنے چل دیے
دُور ہے صبحِ روشن ابھی، سو رہو سو رہو

□□

○

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

اب تو جھونکے سے لرز اُٹھتا ہوں
نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے

اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر
ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے

سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے

اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

اب وہ دریا، نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
مَیں بھی آباد مکاں تھا پہلے

اُڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیُور
سرو اک شوخ جواں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دُنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

ہم نے آباد کیا مُلکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں
درد مجبورِ فغاں تھا پہلے

ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے

ہم نے محفوظ کیا حُسنِ بہار
عطرِ گُل صرفِ خزاں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

□□

اکیاوَن

ذات کے مُسافر

مُنیر نیازی کی نظموں کا اُنتخاب
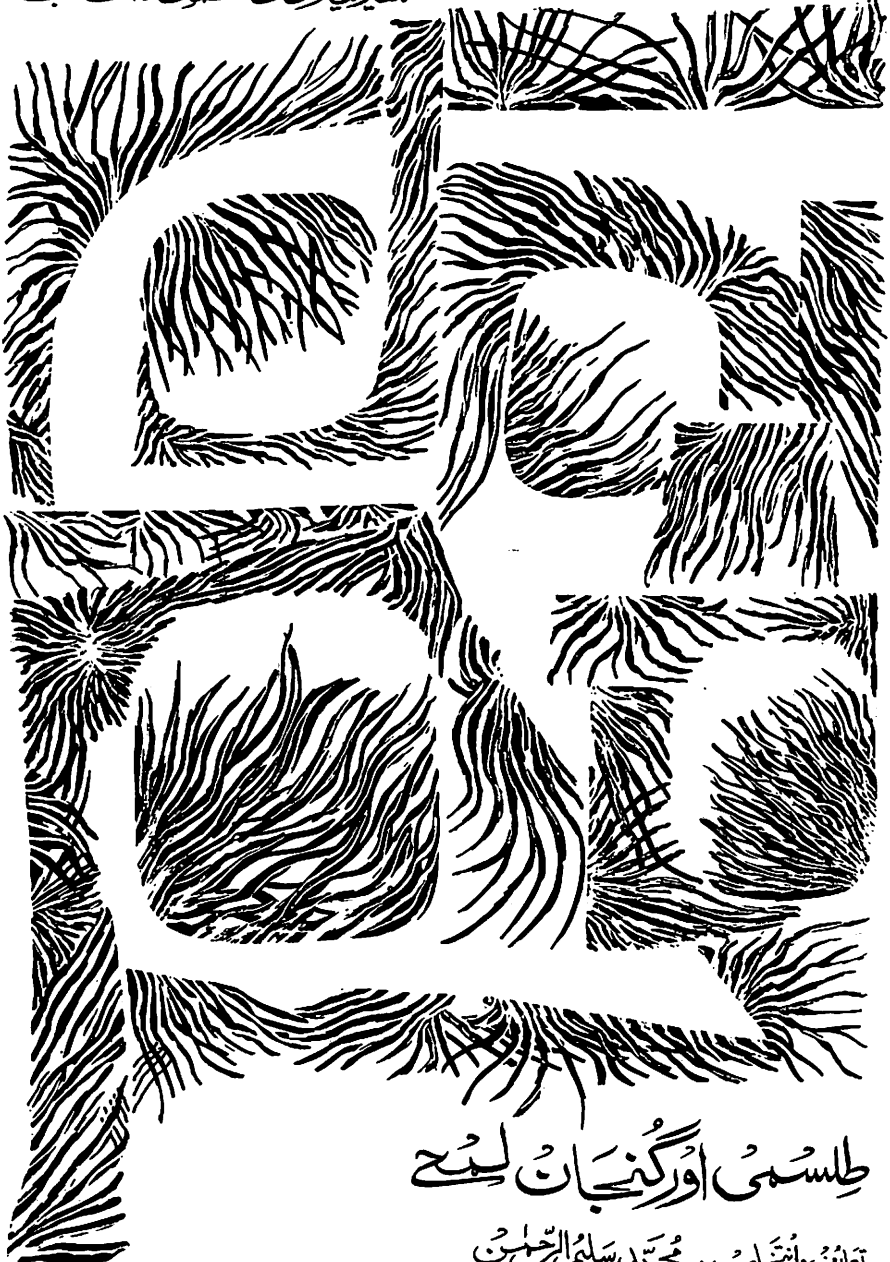
طلسمی اور گنجان لمحے

تعارف و انتخاب : محمد سلیم الرحمٰن

تینتیس نظمیں

صدا بصحرا

برسات

خزاں

رشتۂ خیال

خلش

ایک خیال

ایک آدمی

آدھی رات میں ایک نیم وا دریچے

بچوں جیسی باتیں

راستے کی تھکن

آخری عمر کی باتیں

موسمِ بہار کی دوپہر

لیلیٰ

چور دروازے

ایک رات کی بات

تنہائی

سیرِ سحر آب زارِ بنگال

بے سود سفر کے بعد آرام کا پل

میں، وہ اور رات

رات کی اذیت

اداس کرنے والی آواز

دور کے نگر

سفر سے روکنے والی آواز

آغازِ زمستاں میں دوبارہ

دوست ستارے کو چمکتے رہنے کا اشارہ

ساکت تصویروں کا باطن

حسن میں گناہ کی خواہش

ایک منزل پر ایک دعا

اس رخِ روشن کو دیکھنے کی تمنا

ایک عالم سے دوسرے عالموں کا خیال

دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ

دشمنوں کے درمیان شام

شب خون

یہ شاعری دریافت بھی ہے اور بازیافت بھی - یہ دہرا عمل آپس میں گتھا ہوا اور توام ہے - مانڈرتی، بھولی بسری یادوں کو حال کے کسی وجدانی لمحے میں یک بیک زندہ اور تابندہ دیکھنا، کشف کے کسی تناظر میں اپنے ماضی کو نئے سرے سے سمجھنے کے قابل ہو جانا یہ سب اور کیا ہے - منیر نیازی کی شعری دنیا ایسے ہی طلسمی اور گنجان لمحوں کی یکجائی ہے -

پرانے قصوں میں سنتے آئے ہیں کہ جب کوئی مہم جو کسی بے مثل سوغات کی تلاش میں نکلتا ہے اور اس کا کسی فیصلہ کن مگر زہر گداز مرحلے سے گزر ہوتا ہے تو اسے سختی سے تاکید کی جاتی ہے کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھے - پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں - کسی نہ کسی سطح پر مہم جو تو ہم سب ہیں اور ہمیں دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی ایسے مطلق بخشنہار کی تلاش رہتی ہے جس سے طاقت مانگیں تو طاقت ملے، حیرت چاہیں تو حیرت ملے اور ذلت کے خواہاں ہوں تو ذلت ملے - لیکن ذرا سا کھٹکا ہوتے ہی اپنی تعریف کے دو کلمے یا ہمدردی کے دو بول سنتے ہی ہم میں سے بیشتر مڑ کر دیکھنے لگتے ہیں اور کہیں کے نہیں رہتے -

بعض اہلِ نظر کا خیال ہے کہ انسان کی آنکھیں صرف بچپن ہی میں کھلی رہتی ہیں - جاگنے کی یہ مہلت ختم ہوتے ہی وہ، اپنے معمولات کا اسیر اور عادتوں کا غلام ہو کر، باقی عمر سوئے سوئے گزار دیتا ہے - اس کی آنکھ کبھی کسی صدمے یا دستک سے وقتی طور پر کھل بھی جائے تو اسے بس اپنا ماضی ہی نظر آتا ہے - وہ دریافت کا اہل نہیں رہتا اور دیکھا جائے تو بازیافت کا اہل بھی نہیں رہتا - جو رات ہی میں رہتا ہو اور یہ بھول چکا ہو کہ دن بھی کوئی شے ہے اسے رات کی کیا تمیز ہو -

شاعر بھی ایک طرح کا مہم جو ہوتا ہے - مگر بیشتر شاعر ابتدائی چند کامیابیوں کے بعد سو سے جاتے ہیں - عالم بیداری میں دیکھے اور سوچے ہوئے وہی چند ایک منظر، وہی گنے چنے خیال ان کی آنکھوں اور ذہن میں گھومتے رہتے ہیں - جب اپنے مزاج کو بدلنے اور نئی سمت میں قدم بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جب پالتو ناؤں اور معشوق عیبوں کو قربان کرنا ضروری ہو جاتا ہے تو وہ سہم کر پیچھے مڑ کر دیکھنے لگتے ہیں - ان کی شاعری پتھرا جاتی ہے، تکرار بن کر رہ جاتی ہے، جیسے ریکارڈ پر سوئی اٹک جائے اور ایک ہی لفظ بار بار سنائی دے -

منیر نیازی نے، بطور شاعر، ابھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، اور یہ بڑی بات ہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماضی کی اس کے ہاں کوئی اہمیت نہیں - ماضی اس کے لیے بہت بڑی اور "بھاری" حقیقت ہے؛ ان معنوں میں بھاری جس طرح بعض جگہیں "بھاری" ہوتی ہیں - بچپن اور نوجوانی کی یادیں اس کے جلو میں چلنے والی وہ روشنیاں ہیں جن سے اس کی شاعری کی راہیں منور ہوتی ہیں اور دریافت کا عمل آسان ہو جاتا ہے - منیر نے ان یادوں کو نہ صرف ہمیشہ بڑے پیار سے جگائے رکھا ہے بلکہ "ہر حال" میں ان یادوں کی، ریزہ ریزہ اور تار تار ہی سہی، جھلک دیکھی ہے اور اس جھلک کی اعانت اور رعایت سے اپنی دریافتوں کو، اپنی بیداریوں کو نئے تناظر میں رکھ کر پرکھا ہے، نئی گہرائی کا حامل پایا ہے - یہاں دریافت بازیافت میں گھل مل گئی ہے - اپنے حافظے کو اس طرح شاعری کی راہ میں خرچ کرتے جانے کا ایک فائدہ اور بھی ہے - بیتے دنوں کی جزئیات اور ریزگی کو کسی تخلیقی وضع سے دہرانے سے ماضی کو تسخیر اور "کشتہ" کیا جا سکتا ہے، حال پر غالب آ جانے سے روکا جا سکتا ہے -

منیر نیازی ایک آزاد شاعر ہے - اس کی شاعری میں نہ زبردستی کی فلسفہ آرائی ہے نہ مانگے تانگے کا سیاسی شعور ہے نہ عصری فیشنوں کا عکس ہے - بس ایک خالص انسانی تجربے کا ملخص ہے جسے گنے چنے مگر نکھرے اور تہہ دار لفظوں میں ادا کیا گیا ہے - ایک ایسے دور میں جہاں بے تحاشا عبارتوں کے انبار لگائے جا رہے ہوں اور عبارتیں بھی ایسی جن کی حیثیت کوہ کندن کاہ بر

اور دن سے زیادہ نہ ہو، جہاں ناکارہ لفظ کارگر لفظوں کو کھدیڑ رہے ہوں کہ معاشیات کے اصول کے تحت کھوٹی کرنسی کھری کرنسی کو بازار بدر کر دیتی ہے، وہاں ایسا سلیقہ اور ایسی کفایت قابلِ احترام ہے۔

منیر نیازی کے اندر ایک بہت قدیم اور اوائلی آدمی چھپا ہوا ہے۔ یہ آدمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے غار سے نکل کر بدلے ہوئے زمین آسمان کو افسوس اور حیرت سے دیکھتا ہے اور آہ بھر کر واپس چلا جاتا ہے۔ یہ چیزوں کو ہماری نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسی لیے منیر نیازی کے بیان کیے ہوئے منظروں میں نرالی سی اجنبیت ہوتی ہے۔ اوائلی آدمی کا خیال تھا کہ دنیا نادیدہ قوتوں سے آباد ہے اور دنیا میں رہ کر ان سے نباہ کیے بغیر چارہ نہیں، خواہ یہ نباہ ہیبت کی سطح پر کیا جائے یا حیرت کی، ان سے اطاعت کا رشتہ جوڑا جائے یا محبت کا۔ اس قدیم نباہ کا پرتو ہمیں منیر نیازی کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس کی نظموں اور غزلوں میں انسانی اور غیر انسانی زندگی کی غیر منقسم اساس کا گہرا احساس رچا ہوا ہے۔

کبھی کبھار اس شاعری کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہو سکتا ہے کہ یہ بڑی حد تک متحرک تو ہے لیکن بس اس چیتے کی طرح جسے رلکے نے اپنی نظم میں دوام بخشا ہے۔ نظر یہی آتا ہے کہ بعض موضوعات کو بار بار چھیڑا گیا ہے۔ مثلاً منیر نیازی نے اپنے عہد کو بارہا شام یا رات کے روپ میں اور کبھی پت جھڑ کے پیرائے میں دیکھا ہے۔ شام اور رات کا ذکر، اور وہ بھی اس تواتر سے، اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں اندھیر ہو چلا ہے، اور اندھیر کے کئی اور معنی بھی ہیں۔ اس لیے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ پورا دور غروب ہو رہا ہے۔

لیکن یہ تکرار ظاہری ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ منیر کی شاعری کا مافیہ، اس کا اندازِ نظر آہستہ آہستہ بدلتا اور وسیع ہوتا رہا ہے۔ یہاں اس کی عجیب نظم "ساکت تصویروں کا باطن" کی طرح اندر ہی اندر ایک پُرہیبت تضاد سرگرمِ عمل ہے جو باہر سے دکھائی تو نہیں دیتا مگر اپنی موجودگی کا یقینی طور پر احساس دلاتا رہتا ہے۔ معنویت کی سطح پر اس تبدیلی میں تعقل کو دخل نہیں۔ اس کی حیثیت نامیاتی ہے جیسے کوئی اُگ آنے والی شے جو سال بہ سال تھوڑی تھوڑی بلند اور بار آور ہو رہی ہو۔ یہ ایک خود دار اور خودنگر، آہستہ مگر بلیغ نشو ہے جس کے قوام میں صبر اور شکر بھی ہے اور تھوڑا سا مجذوبانہ جلال بھی۔

سب سے بڑی تبدیلی جو منیر نیازی کے کلام میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ ابتدائی دور کی نظموں اور غزلوں کے مقابلے میں، جہاں حزن و فراق اور آسیب و آشوب کا وزن زیادہ تھا، اب اس کی شاعری میں، جسے میں پُرامید یا رجائی شاعری تو نہیں کہہ سکتا، ایک طرح کی سیرچشمی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ شاعری دکھوں اور مایوسیوں سے تو دور نہیں، نہ انسانی زندگی اور دنیاوی مظاہر کی بے ثباتی سے بے خبر ہے، لیکن ایسی تمکین کی حامل ضرور ہے جس سے حوصلہ بلند ہوتا ہے۔

منیر نیازی نے اوّل تا آخر شاعر رہنے اور شاعر کہلانے کی خاصی قیمت ادا کی ہے۔ اس نے جذباتی سطح پر بھی زخم کھائے ہیں اور دنیوی اعتبار سے بھی زک اٹھائی ہے۔ اس تنگ حالی کا تو میرے پاس کچھ مداوا نہیں لیکن اتنا خسارہ اٹھا کر بھی اس نے اردو اور پنجابی ادب کو جو فیض پہنچایا ہے اس کے لیے سپاس گزار نہ ہونا سبک وضعی ہوگی۔

اس انتخاب میں کوئی زمانی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ نئی پرانی نظموں کو رلا ملا دیا گیا ہے۔ ایک اور بات یہ کہ منیر نیازی کی غزلیں اس کی نظموں سے کم اہم نہیں اور الگ انتخاب کی متقاضی ہیں۔

طالب علمی کے زمانے میں (اور اس کے بعد بھی) ہم والٹر ڈی لا میر کی ایک نظم "دی لسنرز" پر ہزار جان سے فریفتہ تھے۔ پتہ نہیں ابھی اور کب تک ہمیں یہ نظم اپنے سحر کی نیرنگیاں دکھاتی کہ منیر کی "صدا بصحرا" شائع ہو گئی۔ چھ مصرعوں کی اس ظالم نظم نے ہم سے اتنے بڑے شاعر کا کیسا خوبصورت بیان چھین لیا۔ کس سلیقے سے اس کی ابتدا تھی، کس طرح مونولاگ کا حسن نکھرا تھا اور کیسے کیسے الفاظ نے آسیب زدہ ماحول کا تاثر بڑھایا تھا۔ ہم اس کے بیان کو سنتے اور سر دھنتے رہے تھے ——— لیکن منیر نے بات کی اور اس کے بعد "اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور" کے بول پر ختم کر دی اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے بھاری دروازے اور انتظار کرنے والے کے درمیان سے صدیوں کے بے تحاشا جھکڑ گزر گئے اور بھاری دروازے کے پیچھے اُگی ہوئی گھاس، غلام گردش پر اُگی ہوئی جنگلی بیلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ پھر بھاری دروازے کے کھلے ہونے کے زمانے اور بند ہونے کے بعد کی مدت میں اتنے جگ بیت گئے کہ آگے اور پیچھے کا زمانہ ایک ہو گیا۔ ان قرنوں میں اس قلعہ نما محل پر کیا بیتی، ایک داستان ہے جسے اپنی زندگی کے ساتھ طول دیتے جائیے۔

——— اشفاق احمد

صدا بصحرا

○

چاروں سمت اندھیرا گُپ ہے اور گھٹا گھنگھور
وہ کہتی ہے "کون ——— ؟"
میں کہتا ہوں "میں ——— ،
کھولو یہ بھاری دروازہ
مجھ کو اندر آنے دو ———"
اس کے بعد اک لمبی چُپ اور تیز ہوا کا شور

برسات

○

آہ! یہ بارانی رات
مینہہ، ہوا، طوفان، رقصِ صاعقات
شش جہت پر تیرگی اُمڈی ہوئی
ایک سناٹے میں گم ہے بزم گاہِ حادثات
آسماں پر بادلوں کے قافلے بڑھتے ہوئے
اور مری کھڑکی کے نیچے کانپتے پیڑوں کے ہات
چارسو آوارہ ہیں
بھولے، بسرے واقعات
جھکڑوں کے شور میں
جانے کتنی دُور سے
سُن رہا ہوں تیری بات

▱

خزاں

○

ہوا کی آواز
خشک پتوں کی سرسراہٹ سے بھر گئی ہے
روش روش پر فتادہ پھولوں نے
لاکھوں نوحے جگا دیے ہیں
سلیٹی شامیں، بلند پیڑوں پہ غل مچاتے
سیاہ کوّوں کے قافلوں سے اَٹی ہوئی ہیں
ہر ایک جانب خزاں کے قاصد لپک رہے ہیں
ہر ایک جانب خزاں کی آواز گونجتی ہے
ہر ایک بستی کشاکشِ مرگ و زندگی سے نڈھال ہو کر
مسافروں کو پکارتی ہے کہ ——— "آؤ
مجھ کو خزاں کے بے مہر، تلخ احساس سے بچاؤ"

▱

رشتۂ خیال

○

کبھی کسی بام کے کنارے
اُگے ہوئے پیڑ کے سہارے
مجھے ملی ہیں وہ مست آنکھیں
جو دل کے پاتال میں اُتر کر
گئے دنوں کی گپھا میں جھانکیں

کبھی کسی اجنبی نگر میں
کسی اکیلے، اُداس گھر میں
پری رُخوں کی حسیں سبھا میں
کسی بہارِ گریز پا میں
کبھی سرِ رہ، کبھی سرِ کوُ
کبھی پسِ در، کبھی لبِ جوُ
مجھے ملی ہیں وہی نگاہیں
جو ایک لمحے کی دوستی میں
ہزار باتوں کو کہنا چاہیں

⏥

خلش

○

وہ خوبصورت لڑکیاں
دشتِ وفا کی ہرنیاں
شہرِ شبِ مہتاب کی
بے چین جادوگرنیاں
جو بادلوں میں کھو گئیں
نظروں سے اوجھل ہو گئیں
اب سرد، کالی رات کو
آنکھوں میں گہرا غم لیے
اشکوں کی بہتی نہر میں
گلنار چہرے نم کیے
ہستی کی سرحد سے پرے
خوابوں کی سنگیں اوٹ سے
کہتی ہیں مجھ کو "بے وفا!
ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے
سُکھ کا خزانہ مل گیا ہے"

⏥

ایک خیال

○

دنیا سے دُور اس کی بھری محفلوں سے دُور
بھٹکا ہے دل ہوا کی طرح منزلوں سے دُور
اُٹھی ہے موجِ درد کوئی دل کے آس پاس
پھرتی ہے اک صدا سی کہیں ساحلوں سے دُور

ایک آدمی

○

کل دیکھا اک آدمی، اٹا سفر کی دُھول میں
گم تھا اپنے آپ میں، جیسے خوشبو پھُول میں

آدھی رات میں ایک نیم وا دریچہ

○

آدھا چہرہ روشنی میں ہے آدھا کالے پردے میں
ایک آنکھ ہے سُورج جیسی ایک ہے کالے پردے میں
بھید نہ اب تک باہر آیا آدھے گرے نقابوں سے
آنکھ ہمیشہ گھری رہی ظاہر اور چھپے سرابوں میں

بچوں جیسی باتیں

آج کا کام نہ کل پر ٹالو
جو کچھ لکھنا ہے لکھ ڈالو
اِدھر اُدھر کی جھوٹی باتیں
ذرا ذرا سی جیتیں ماتیں
جانے پھر کب موت آجائے
دل کی دل ہی میں رہ جائے

راستے کی تھکن

آس پاس کوئی گاؤں نہ دریا اور بدریا چھائی ہے
شام بھی جیسے کسی پرانے سوگ میں ڈوبی آئی ہے
پل پل بجلی چمک رہی ہے اور میلوں تنہائی ہے

کتنے جتن کیے ملنے کو پھر بھی کتنی دُوری ہے
چلتے چلتے ہار گیا مَیں پھر بھی راہ ادھوری ہے
گھائل ہے آواز ہوا کی اور دل کی مجبوری ہے

آخری عُمر کی باتیں

وہ میری آنکھوں پر جھک کر کہتی ہے "مَیں ہُوں"
اس کا سانس مرے ہونٹوں کو چُھو کر کہتا ہے "مَیں ہوں"
سونی دیواروں کی خموشی سرگوشی میں کہتی ہے "مَیں ہوں"
"ہم گھائل ہیں" سب کہتے ہیں
مَیں بھی کہتا ہوں ——— "مَیں ہوں"

موسمِ بہار کی پہلی دوپہر

ہلکی ہلکی گرم ہوائیں ہلکی ہلکی گرد
ویراں مسجد کے پیچھے بتوہر کی سبز قطار
اس کے عقب میں لال اور نیلے پھولوں کے انبار
اونچے اونچے پیڑ ہیں جیسے لمبے لمبے مرد

یا سنسان قلعے کی خاکی، اجڑی سی دیوار
جس کے نیچے چھپے ہوئے کچھ دشمن کے سردار
ہاتھ میں پکڑے جگمگ کرتے سورج کی تلوار
چور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں رنگوں کا تہوار

لیلیٰ

رات کی اونچی فصیلوں پر دمکتے، لال ہونٹوں والی کالی جشنیں خنجر بکف
اور فصیلوں سے گھرے جادو بھرے شہروں کی دھندلی روشنی میں ہر طرف
دائروں میں گیت گاتی دلہنوں کے مرمریں ہاتھوں میں بجتے زرد دف

شش جہت کی تیرگی میں دمبدم بڑھنے لگی ہے مور پنکھوں کی صدا
چھا رہا ہے کھڑکیوں پر سرنگوں، پھولوں بھری بیلوں کا رنگیں سلسلہ
لگ رہا ہے سرخ ریشم سے سجے کمروں میں شرمیلی نگاہوں کا رسیلا جمگھٹا

کس حسیں، خاموش گلشن میں کھلا ہے میری چاہت کا دمکتی پنکھڑیوں والا گلاب
کون سے جادو بھرے کوچے میں بہتی ہے ان آنکھوں کی خمار آگیں شراب
کب فصیلِ شب کے اک پوشیدہ دروازے سے جھانکے گا وہ چمکیلا سراب
بول! اے بادِ شبانہ کے نرالے نقش دکھلاتے ہوئے گونگے رباب

چور دروازے

○

نکہت کی آنکھوں میں گہرے رازوں کی کچھ باتیں ہیں
سات سمندر پار کے شہروں کی کالی برساتیں ہیں
دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رونے والی راتیں ہیں

نکہت کے بکھرے بالوں میں سکھ کا خزانہ ملتا ہے
دل کو عجب خیالوں میں رہنے کا بہانہ ملتا ہے
ایک گلابی پھول مہک کے طوفانوں میں کھلتا ہے
کسی پرانی خوابگاہ کا ریشمی پردہ ہلتا ہے

تنہائی

○

میں، نکہت اور سونا گھر
تیز ہوا میں بجتے در
لمبے صحن کے آخر پر
لال گلاب کا تنہا پھول

اب میں اور یہ سونا گھر
تیز ہوا میں بجتے در
دیواروں پر گہرا غم
کرتی ہے آنکھوں کو نم
گئے دنوں کی اڑتی دھول

ایک رات کی بات

○

باہر بارش برس برس کر
میٹھے گیت سناتی ہے
اور کمرے کے اندر نکہت
مجھ کو دیکھے جاتی ہے
میں شرما کر کہتا ہوں
"دیکھو! یہ اچھی بات نہیں
اسی طرح کے پاگل پن میں
بیت نہ جائے رات کہیں"

سیرِ سحرِ آب زارِ بنگال

○

رخصتِ سرما کی صبح ، سرد ، نم ، سنگین سی
خوابِ خاموشی کی تہہ میں اک جھلک رنگین سی
بانس کا جنگل ، ہوا ، پانی پرانی جھیل کا
سبز ڈر پر رنگ جیسے آسماں کے نیل کا
گرتے جاتے شہر دونوں سمت اک انبار میں
کھنچتی جاتی خاکِ میداں ایک ہی رفتار میں
ہلتے جاتے نقش سے کچھ پھیلتی دیوار پر
بجھ کے گرتے حرف سے حدِ سفر آثار پر
ہر طرف خوشبو ہوائیں ، بن میں ، قربِ آب کی
ایک پُر اسرار خواہش دل میں مرگِ آب کی

▱

بے سود سفر کے بعد آرام کا پل

○

پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر
پھر وہی خوابِ تمنا پھر وہی دیوار و در
بلبلیں ، اشجار ، گھر ، شمس و قمر
خوف میں لذت کے مسکن ، جسم پر ان کا اثر
موسموں کے آنے جانے کے وہی دل پر نشاں
سات رنگوں کے علم نیلے فلک تک پر فشاں
صبح دم سونے محلے پھیکی پھیکی سہ پہر
پھول گرتے دیکھنا شاخوں سے فرشِ شام پر
خواب اس کے دیکھنا موجود تھا جو بام پر
پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر

▱

میں، وہ اور رات

○

کمرے میں خاموشی ہے اور باہر رات بہت کالی ہے
اونچے اونچے پیڑوں پر سیاہی نے چھاؤنی ڈالی ہے
تیز ہوا کہتی ہے پل میں برکھا آنے والی ہے

وہ سولہ سنگار کیے اپنی ہی سوچ میں کھوئی ہوئی ہے
سانسوں میں وہ گہرا پن ہے جیسے بے سدھ سوئی ہوئی ہے
دل میں سو ارمان ہیں لیکن میری سمت نگاہ نہیں ہے
یوں بیٹھی ہے جیسے اس کے دل میں کسی کی چاہ نہیں ہے

رات کی اذیت

○

رات بے حد چپ ہے اور اس کا اندھیرا شرمگیں
شام پڑتے ہی دمکتے تھے جو رنگوں کے نگیں
دور تک بھی اب کہیں ان کا نشاں ملتا نہیں

اب تو بڑھتا آئے گا گھنگھور بادل چاہ کا
اس میں بہتی آئے گی اک مدھ بھری میٹھی صدا
دل کے سونے شہر میں گونجے گا نغمہ چاہ کا

رات کے پردے میں چھپ کر خوں رلاتی چاہ تو
اس قدر کیوں دور ہو مجھ سے ذرا یہ تو کہو
میرے پاس آ کر کبھی میری کہانی بھی سنو

سسکیاں لیتی ہوائیں کہہ رہی ہیں "چپ رہو"

اُداس کرنے والی آواز

○

آدھی رات اور ایسا موسم
ساری دُنیا سوتی ہے
دُور سے آتی تیز ہوا
خوشبو کے ہار پروتی ہے
چھُپ کر دیکھوں کون ہے یہ
جو پھُوٹ پھوٹ کر روتی ہے

دُور کے نگر

○

دُور کے نگروں میں جانے کا دل کو شوق بڑا ہے

ان میں سُکھ سے بھرے آنگن ہیں، ٹھنڈی تیز ہوا ہے
رنگ برنگی کامنیوں کے رُوپ کا دیپ جلا ہے
گلیوں میں کاجل سی سجی آنکھوں کا میلہ لگا ہے

ان نگروں کی کھوج میں پھرتے جیون انت ہوا ہے

سفر سے روکنے والی آواز

○

"ٹھہر جانا —— ٹھہر جانا ——"
بُلاتی ہے، ارے ناداں
تجھے آواز گھایل سی

سنبھل جانا —— نہ رُک جانا
صدا ہے یہ، ارے ناداں
ہوا میں اُڑتے بادل کی

آغازِ زمستاں میں دوبارہ

○

غروبِ مہر کا منظر گھڑی ہوئی گزرا
بس ایک پل کو نیستاں اسی طرح گزرا
گیاہِ سبز کی خوشبو اسی زمانے کی
اسی طرح کی مسرت بہار آنے کی
وہی جمالِ در و سقف و بام ہے، مَیں ہوں
کنارِ رود سیہ فام شام ہے، مَیں ہوں

دوست ستارے کو چمکتے رہنے کا اشارہ

○

ستارے! مرے خوابِ اُمید کے!
سحر آنے والی ہو یا شامِ غم
افق ہو سفر کا کہ بامِ الم
ہو کشتِ ثمر ور کہ ویراں چمن
نیا شہرِ امکاں کہ یادوں کا بن
ستارے مرے خوابِ اُمید کے

ساکت تصویروں کا باطن

○

اک موسم ہیں سارے شجر بنجر بنجر سے لگتے ہیں
پھر بھی اندر ہرا ہے ان کا یوں اوپر سے لگتے ہیں
جیسے اچانک کبھی کھنڈر آباد نگر سے لگتے ہیں

دل ہیبت سے بھرے ہوئے اور چہرے ان کے خالی ہیں
جو کچھ ہے باطن میں ہے اور ظاہر جن کے خالی ہیں

آنکھ جمی ہے ان چہروں پر سارے عہد کے لوگوں کی
جیسے انھی کے پاس دوا ہے ان کے سارے روگوں کی

حسن میں گناہ کی خواہش

حسن تو بس دو طرح کا خوب لگتا ہے مجھے
آگ میں جلتا ہوا
یا برف میں سویا ہوا
درمیاں میں کچھ نہیں
صرف ہلکا سا اچنبھا، عکس سا، اڑتا ہوا
اک خیال انگیز قہقہہ اپنی آدھی موت کا
اک الم افزا فسانہ خونِ دل کے شوق کا
اک کنارے سے صدا دو تو وہ چلتی جائے گی
دور تک اپنے گنہ پر ہاتھ ملتی جائے گی

□

ایک منزل پر ایک دعا

پھرتی ہوئی بے چین ہواؤ!
میری مدد کو آؤ
اڑتی ہوئی ہم درد صداؤ
میری مدد کو آؤ
آؤ مل کر اس دنیا کو جنت کی تصویر بنا دیں
امن اور حسن کا خوابِ مسرت آدم کی تقدیر بنا دیں
یہ اک کام ہے جس میں آ کر میرا ہاتھ بٹاؤ
پھرتی ہوئی بے چین ہواؤ!
اڑتی ہوئی ہم درد صداؤ!

□

اس رخِ روشن کو دیکھنے کی تمنا

کس کے لیے وہ گیت لکھوں ——
سارے عالم کے شہروں میں جس کی گونج سنائی دے
جس کو سن کر چشمِ جہاں کو خواب اک نیا دکھائی دے
کس کے لیے وہ گیت لکھوں ——

□

ایک عالم سے دوسرے عالموں کا خیال

○

نیلا گرم سمندر
اوپر دھوپ کا شیشہ چمکے
موتی اس کے اندر

یاد آئی ہیں کتنی باتیں
بیٹھ کے اس ساحل پر
اک بے مقصد عُمر کے قصّے
بوجھ ہیں جو اب دل پر

کیا کیا منظر دیکھے مَیں نے
کیسی جگہوں میں گھوما
کیسے مکانوں میں دن کاٹے
کن لوگوں میں بیٹھا

یہ منظر بھی یاد آئے گا
اور کسی موسم میں
اور کسی دریا کے کنارے
اور کسی عالم میں

دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ

○

میرے جسم میں زہر ہے تیرا
میرا دل ہے تیرا گھر
تو موجود ہے ساتھ ہمیشہ
خوف سا بن کر شام و سحر
تیرا اثر ہے میرے لہو پر
جیسے چاند سمندر پر
اتنی زرد ہے رنگت تیری
جم جاتی ہے اس پہ نظر
تو ہے سزا میرے ہونے کی
یا ہے میرا زادِ سفر
کرے گا تو بیمار مجھے یا
بنے گا نامعلوم کا ڈر
رہے گا دائم گہری تہہ میں
جیسے اندھیرے میں کوئی دَر
گم کر دے گا راہ میں مجھ کو
یا دے گا منزل کی خبر
تو ہے میرا دوست کہ دشمن
یہ تو بتا مجھ کو، اے زر!

▱

دُشمنوں کے درمیان شام

○

پھیلتی ہے شام دیکھو ڈوبتا ہے دن عجب
آسماں پر رنگ دیکھو ہو گیا کیسا غضب
کھیت ہیں اور ان میں اک روپوش سے دشمن کا شک
سرسراہٹ سانپ کی، گندم کی وحشی گر مہک
اک طرف دیوار و در اور جلتی بجھتی بتّیاں
اک طرف سر پہ کھڑا یہ موت جیسا آسماں

شبِ خُون

○

جب بن سیاہ رات کے تاروں سے بھر گئے
کنجِ چمن میں چمکے شگوفے نئے نئے
مجھ کو ہوا نے بات سُجھائی عجیب سی
بادل میں ایک شکل دکھائی عجیب سی
چاند آسماں کی سیج پہ سویا ہوا ملا
رنگِ گُلِ انار میں لتھڑا ہوا ملا
اے عاشقانِ حُسنِ ازل! غور سے سُنو
یہ داستانِ جنگ و جدل غور سے سُنو
مَیں برگِ بے نوا تو نہیں ہوں کہ چُپ رہوں
دل کے کسی بھی شعلے کو عُریاں نہ کر سکوں
مَیں تیغ ہاتھ میں لیے سُوئے فلک گیا
جذبوں کے رس سے مہکے ہوئے چاند تک گیا
کافی تھا ایک وار مری تیغِ تیز کا
مہتاب کے بدن سے لہو پھوٹ کر بہا

رادار

○

سانی فاروقی کی نظمیں

○

زوال
سسٹر ماریا تیریزا
امانت
خالی بورے میں زخمی بلّا
پام کے پیڑ سے گفتگو
موت کی خوشبو
خرگوش کی سرگزشت
ایک سؤر سے
شیر امداد علی کا میڈک
شاہ صاحب اینڈ سنز

○

تعارف و انتخاب:
شمیم حنفی

رادار: ساقی فاروقی

کچھ سال گزرے، میرے ایک ہم عصر مندی کوی نے اپنی کتاب کے تعارف میں لکھا تھا ——— ان نظموں کا بنیادی عمل ایکس رئینگ کا عمل ہے۔ ہوسکتا ہے یہ تصویریں کسی ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کا سامان نہ بن سکیں مگر ان میں سچائی کا ایک نیا بھید پانے کے جتن کیے گئے ہیں۔ سو یہ ایک نئے تخلیقی استعارے کی تلاش کا عمل ہے۔

آج ساقی کی ان نظموں پر نگاہ پڑتے ہی یہ بات اچانک یاد آگئی:

غنیم آسمانوں میں
دشمن جہازوں کی سرگوشیاں ہیں
ستاروں کی جلتی ہوئی بستیاں ہیں
اور آنکھوں کے رادار پر
صرف تاریک پرچھائیاں ہیں ———

پکاسو کی گوئرنیکا میں اسپین کی خانہ جنگی سے ہم رشتہ بربادی کی یاد دلاتا ہوا ایک منظر۔ یہ منظر جس ابتری کی خبر دیتا ہے وہ ایک فرد کے باطن اور اس کے آتش گیر ماحول کی ساری دھرتی پر چھایا ہوا ہے۔ ان نظموں کا نمایاں ترین تاثر دہشت کا ہے۔ ییٹس نے اسی کی ترسیل کے لیے Terrible Beauty کی اصطلاح ڈھالی تھی۔ ان میں جھلمل جھلمل کرتی نرم زرتار حجاب آفرینی کے بجائے اس زمین کا پرتو ملتا ہے جو کھردری، ناہموار اور غیر منترہ ہے مگر اسی ناہمواری اور کھردرے پن میں ان رنگوں کا جادو جاگتا ہے جن سے ہماری کائنات کے خرابے اور آبادیاں پہچانی جاتی ہیں۔ پیڑ، پودے، پھول، پیلے لال پروں والی تتلیاں، پانی، پتھر، پربت، پرندے، چوپائے ——— پھر جہاز، رادار، ایکس رے شعاعیں، آب دوز کشتیاں، دھواں، سرجن، ڈاکٹر، غرضکہ وہ لکیریں بھی جو جدید تمدن کے اختیارات اور ارادوں نے کھینچی ہیں۔

بظاہر ایک دوسرے سے دور افتادہ اسموں اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی اشیاء کی صف بندی سے بھی کبھی کبھی انوکھی تخلیقی اکائی جنم لیتی ہے۔ ہمارے عہد کی شاعری کا ایک قرینہ یہ بھی ہے۔ سنتے آئے ہیں کہ پرانے وقتوں میں شاعری کی تربیت کا سبق یہ ہوتا تھا کہ آدمی ان جانداروں اور روح سے خالی، شمار کی جانے والی ان ساری صورتوں اور رنگ برنگی مورتوں کے نام یاد کرے جن کے حوالے سے وہ اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے۔ اس طرح دھیرے دھیرے اسے ایک حسی مساوات کا اور اپنے اندروں میں پوشیدہ ان قوتوں کو بروئے کار لانے کا سبق بھی مل جاتا تھا جن سے عام لوگ بے خبر گزر جاتے ہیں۔ سچ ہے کہ اس آگہی کا بوجھ اٹھائے بغیر بھی زندگی کی جاسکتی ہے۔ شاید اسی واسطے ہمارے بہت سے سخنور خلوت کدوں سے باہر نہیں نکلتے اور مجردات کے سہارے شعر گڑھ لیتے ہیں۔ یہ نظمیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ساقی کا راستہ ایسوں سے الگ ہے۔ وہ اس مہم جو کی مثال ہے جسے ترک کا ذائقہ پسند نہیں۔ جو زندہ لہو کی حرارت اور لمس کی لذت کے ساتھ اپنے زمانے اور صدیوں پرانی کائنات کے تماشے میں شامل ہے۔ جو اپنی ذات سے باہر

بکھرے منظر بھی دیکھتا ہے اور اس منظر میں گھری ذات کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔ جو اپنے آپ سے الگ بھی ہے اور اپنے ساتھ بھی۔ خارج کی دنیا کے جمال کا شیدائی بھی ہے اور ایک شخص، تنہائی کی دہشت کا شکار بھی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے چاروں طرف رنگا رنگ آبادیاں ہیں اور یہ بھی کہ اپنی لغزشوں، لعنتوں اور حماقتوں کے سبب آدمی اپنی بستی میں بھی جلاوطنی کے صدمے اٹھا رہا ہے۔ گویائی ساتھ دیتی ہے تو وہ پیڑوں، پرندوں، تتلیوں، چوپایوں سے بھی کلام کرتا ہے، ترسیل کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں تو خود کو مفلوج و ناکارہ بھی جانتا ہے۔ ساقی کی شاعری بیک وقت کائنات بیتی بھی ہے اور ایک اعتراف نامہ بھی۔

اعتراف میں سچائی نہ ہو تو شاعری تصنعات کا پشتارہ بن جاتی ہے اور سچ کہنے سے آدمی اسی وقت گھبراتا ہے جب ہر حال میں خود کو باعزت اور دوسروں سے ممتاز سمجھنے سمجھانے کی دھن میں ڈوبا ہو۔ ساقی اپنے عہد کے زوال کا ذکر اس زبان میں نہیں کرتا جو منبر کی بلندی سے نیچے اترتی ہے اور سننے والوں کے لیے عبرت کا تازیانہ بن جاتی ہے۔ زیاں کا ایک مستقل احساس اس کے شعور کا ہمرکاب ہے لیکن زیاں کار اگر زمانہ ہے تو خود اپنا دامن بھی اُسے داغدار دکھائی دیتا ہے۔

اس صورت حال کے نتیجے میں ہماری نئی شاعری جس غالب رویے سے منسوب ہوئی ہے وہ اُداسی کا ہے۔ ساقی کی شاعری میں اُداسی کا یہ اسلوب ایک ایسی لَے میں ڈھلتا جاتا ہے جو برہم اور متلاطم ہے۔ جس میں کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی نرم آثاری کے بجائے اس چتنار پیڑ کے پتوں کا شور شامل ہے جو ہواؤں کی زد پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اداسی کا اپنا وقار ہوتا ہے مگر اس وقار میں لذت یا منفی قوت کے ان دیکھے جزیروں اور حواس کی چنگاریوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ ساقی کہ ہر حال میں اپنی حفاظت کا طلب گار ہے اس برہمی کے حوالے سے اپنی انفرادیت کا نشان پاتا ہے اور اسی کے ذریعہ اپنی زخمی انا کا اثبات کرتا ہے۔ پھر یہ برہمی اس کی بعض نفرتوں کو زندہ رکھنے کا بہانہ بھی ہے۔ اور چونکہ وہ (ننھے ملائم خرگوش کی صورت) پُراسرار دنیاؤں کی جستجو سے باز نہیں آتا اس لیے جذبے کا وہ طور چھوڑنے پر آمادہ بھی نہیں جو اس سفر کی محرک قوت ہے۔ یہ برہمی ساقی کے لیے شاید اپنے انکشاف کا سب سے مؤثر پیرایہ ہے۔

ان نظموں کو پڑھتے پڑھتے یہ احساس بھی ہوا کہ ساقی نے اپنے حواس کے گرد ایک اچھا خاصا چڑیا گھر آباد کر رکھا ہے۔ تتلی، مینڈک، جل کنبھی، شارک، چھپکلی، سور، جیلی فش، خرگوش، بلا، گھونگھے، زیبرا، چیتے ——— غالباً اور نظموں میں تجربے کی ڈور سے جانداروں کی اور قسمیں بھی بندھی ہوں گی ——— اس سے ایک طرف زندگی کے ہمہ رنگ استعاروں سے ساقی کے شغف اور کائنات کے تئیں اس کے ایجابی رویے کی تصدیق ہوتی ہے تو دوسری طرف اس کی تخلیقی جسارت اور لسانی آزادی کا نشان بھی اُبھرتا ہے۔ جس طرح تجربوں کی تعمیر کے معاملے میں وہ کسی امتناع کی مداخلت قبول نہیں کرتا اور شعری روایت کے معین کیے ہوئے حجابات سے خوفزدہ نہیں ہے، اسی طرح اظہار کے عمل میں بھی وہ اپنی تخلیقی اُمنگ کا وفادار ہے اور ایک ایسے آہنگ کی تشکیل میں سرگرم جس سے شناسائی کے لیے ہم کسی وسیلے یا اس کے کسی پیش رو یا معاصر کے تعارفی خط کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ایسے لکھنے والے ہمیشہ گنتی کے چند ہوتے ہیں جن کا پتہ کسی کے توسط کا محتاج نہ ہو۔

ساقی فاروقی

ساقی فاروقی

اس مضمون کی حیثیت ایک اشاریے کی سی ہے

معزز خواتین و حضرات، مَیں تنہا ہوں اور تنہائی میں آپ سے مخاطب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری مجبوری دُوہری ہے۔ اظہار بھی اور رسائی بھی۔ یعنی دُکھ اُٹھانا اور لفظوں کو زنجیر کرنا تو لکھنے والے کا مقدر ہے مگر یہ احساس کہ جس استعارے کو جنم دینے کی کوشش میری شاعری میں ملتی ہے اس سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی ذہن میں کوئی نہ کوئی ارتعاش پیدا ہوگا ——— عجب جان آفریں ہے۔ یہ خوش خیالی مجھے خاموش نہیں ہونے دیتی ورنہ یوں ہے کہ لفظوں پر بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔

○

مَیں ایک commited individual ہوں اور ہجوم سے میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اسے افراد بناتے ہیں۔ دس ہزار مزدوروں کے مشتعل ہجوم کے معنی ہوئے دس ہزار مختلف شخصیتوں کے دس ہزار مختلف ذہنوں کا مجموعی اشتعال۔ دراصل میں ظلم سہتے ہوئے فرد کا طرفدار ہوں۔ یعنی مَیں اس کا آدمی ہوں جو دُکھ اُٹھا رہا ہے۔
اب مَیں خیال کی اس منزل پر ہوں جہاں دولت یا غربت کے باعث انسانوں (افراد) سے نفرت یا محبت ممکن نہیں۔ ایک جاہل کسان یا ایک فوجی کمانڈر یا ایک گنوار مزدور یا ایک کروڑپتی سیٹھ میرا دوست یا ہم جلیس اس لیے نہیں بن سکتا کہ ہماری ذہنی لہریں جدا جدا ہیں اور ترسیل کا امکان نہیں مگر مَیں اس معاشرے کے لیے جنگ کرتا رہوں گا جس میں ہم کسی نہ کسی سطح پر کہیں نہ کہیں مِل سکیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ ہمیشہ سے جاری ہے مگر تماشائی بن کر بیٹھنا اور تماشے میں شامل نہ ہونا میرے اختیار میں نہیں کہ ذہنی بیداری ایک طرح کا جبر ہے۔
یوں ہے کہ میلانِ طبع بائیں بازو کی طرف ہے مگر اس لیے نہیں کہ Left is Right بلکہ اس لیے کہ اپنے تجزیے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے گفتگو عوام سے ہے۔

○

چوہتر

مَیں مذہبی آدمی نہیں ہوں ۔ مجھے معلوم ہے کہ مَیں مسلمان اس لیے پیدا ہوا کہ میرے ماں باپ مسلمان تھے ۔ وہ عیسائی یا ہندو یا یہودی ہوتے تو میرا پیدائشی مذہب کچھ اور ہوتا کہ یہ فیصلہ پیدا ہونے والا نہیں پیدا کرنے والے کرتے ہیں اور مَیں ایسے کسی فیصلے کا پابند نہیں جو میری فلاح وبہبود کے لیے ہی سہی، میری اجازت کے بغیر کیا گیا ہو ۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نومولود سے اجازت مانگی جائے مگر یہ تو ممکن ہے کہ وہ نومولود جب آپ سوچ بچار کے قابل ہو تو دوسروں کا فیصلہ بدل سکے ۔ پھر خدا کا معاملہ تو بہت ذاتی معاملہ ہے، یہ ایک فرد اور زمانا معلوم کا رشتہ ہے اور فرد اگر ذہن بھی رکھتا ہو تو اسے اس رشتے کا سراغ خود لگانا چاہیے ۔ میرے دل میں مذہبی لوگوں کی قدر و منزلت غیر مذہبی لوگوں کی قدر و منزلت سے کم نہیں مگر مَیں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے خدا کی نعمت سے محروم ہوں ۔ اگر میرے ذہن کے کمپیوٹر کی پروگرامنگ میں کوئی تبدیلی ہوئی تو میری آنکھیں بیدار رہیں گی ۔ یا میرے دل میں کبھی کوئی ٹِک ٹِک سُنائی دی تو مَیں اس آواز پر اپنے کان بند نہیں کروں گا ۔

○

جوں جوں میری عمر گزرتی جاتی ہے، نباتات اور حیوانات سے میری محبت بڑھتی جاتی ہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ کائنات پر ان کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم انسانوں کا ۔ بلکہ ہم انسانوں نے تو اس کائنات کو بدصورت بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا ۔ ان بچاروں نے تو خوبصورتی ہی خوبصورتی بکھیری ہے ۔ گائے، سؤر، مینڈک، کچھوا، وھیل، شارک، توتا، مینا، ہرن، کبوتر، فاختہ، زیبرا، شیر، ہاتھی، اونٹ، گدھا، گھوڑا، لنگور، آم، جامن، کٹھل، انار، بیلا، جوہی، موتیا، گلاب اور ایسی ہی کروڑوں چیزیں ہماری توجہ چاہتی ہیں کہ یہ عشرت نظارہ ہیں اور جانِ مناظر ہیں ۔ ان سے محبت کرنے کے یہ معنی نہیں کہ انسانوں سے محبت کم ہو جائے گی —— میرا تو یہ عالم ہے کہ جیسے جیسے محبت بڑھتی جاتی ہے دل میں کشادگی آتی جاتی ہے، محبت کا دائرہ محدود ہو تو دل محدود ہو جاتا ہے ۔ میں نے کچھوے کا ایک بچہ پال رکھا ہے ۔ جب اس سے گفتگو کرتا ہوں تو اس کی زندہ اور دُور رس آنکھوں میں ایک عجب تحریر اُبھرتی ہے "یہ کائنات کیا خوبصورت جگہ ہے مگر افسوس کہ یہاں انسان رہتے ہیں ——" ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنے دوسرے "ہمعصروں" کی نظروں سے بھی دیکھنے کی کوشش کرتے رہا کریں ۔ اس میں شاید ہمارا ہی بھلا ہو ۔

—— لندن : ۸ر اکتوبر ۱۹۷۸ء

زوال

○

ہر طرف بڑھتے ہوئے شور سے
گھبرائے ہوئے
آگ کے سامنے
کمہلائے ہوئے
ایک بیرک میں چھپے
آج بیئر پیتے رہے
رُوح کی اوٹ میں
پرچھائیں سی کوئی پھرتی رہی
برف ذی روح نباتات پہ
فالج کی طرح گرتی رہی

سسٹر ماریا تیریزا

○

یادِ بستر میں
تمنا کے پرانے آئینے کے سامنے
جسم کی ایذا دہی میں
روح کی خود لذتی میں
کیا ملے گا؟

روز جیلی فش کی صورت
نارسی کے بادباں کھولے ہوئے
سبز گدلے سوگ ساگر میں
نئی لہریں بنانے
اور پانی کاٹنے میں
کیا ملے گا؟

اپنی تنہائی میں اک دن میری تنہائی ملا دو
مَیں ہی روحِ قدس ہوں
نورِ ازل ہوں
دیر سے تم میں چھپا ہوں
جن دھنک لمحوں کو اپنے دھیان میں
زنجیر کر کے مطمئن ہو
میں انہی کا سلسلہ ہوں
اور تمھاری راز بستہ چھاتیوں ——
—— چاندی کٹوروں سے چھلکنا چاہتا ہوں
مَیں خدا ہوں۔

امانت

○

اک قصبے کے
اک اسکول میں
اک لڑکے نے
تھکی ہوئی اک تتلی پکڑی تھی
اور رہائی کی کوشش میں
اس تتلی کے پروں کا اودا نیلا رنگ
فضا میں بکھر گیا تھا
اس لڑکے نے
میز کے اوپر
پیپر ویٹ کے نیچے رکھ کر
اس کے پر ماچس سے جلائے
اور اس کا دھڑ
پنسل کاٹنے والے چاقو سے
دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا

وہ لڑکا تو چلا گیا
پر تیس برس سے
اس کا گندا چاقو میرے پاس ہے
اور چاقو پر
اس مٹیالے پیلے خون کے دھبّے سے اُلجھن ہے
اور زباں پر ایک کسیلا پن ہے
اتنی تھکن ہے
نیند سے پاگل ہوں

خالی بورے میں زخمی بِلّا

○

جان محمد خان

سفر آسان نہیں

دھان کے اس خالی بورے میں . .

جان اُلجھتی ہے

پٹ سن کی مضبوط سلاخیں دِل میں گڑی ہیں

اور آنکھوں کے

زرد کٹوروں میں

چاند کے سکّے چھن چھن گرتے ہیں

اور بدن میں رات پھیلتی جاتی ہے . . .

آج تمھاری ننگی پیٹھ پر

آگ جلائے کون

انگارے دہکائے کون

جدّوجہد کے

خونیں پھول کھِلائے کون

میرے شعلہ گر پنجوں میں جان نہیں

آج سفر آسان نہیں

تھوڑی دیر میں یہ پگڈنڈی

ٹوٹ کے اک گندے تالاب میں گر جائے گی

میں اپنے تابوت کی تنہائی سے لپٹ کر

سو جاؤں گا

پانی پانی ہو جاؤں گا

اور تمھیں آگے جانا ——

—— اک گہری نیند میں چلتے جانا ہے

اور تمھیں اُس نظر نہ آنے والے بورے ——

—— اپنے خالی بورے کی پہچان نہیں

جان محمد خان

سفر آسان نہیں

پام کے پیڑ سے گفتگو

○

مجھے سبز حیرت سے کیوں دیکھتے ہو
وہی تتلیاں جمع کرنے کی ہوبی
ادھر کھینچ لائی
مگر تتلیاں اتنی زیرک ہیں
ہجرت کے ٹوٹے پَروں پر
ہوا کے دوشالے میں لپٹی

مرے خوف سے
اجنبی جنگلوں میں
کہیں جا چھپیں . . .

اور تھک ہار کر واپسی میں
سر کتے ہوئے ایک پتھر سے بچتے ہوئے
اس طرف میں نے دیکھا
تو ایسا لگا
یہ پہاڑی کسی دیو ہیکل فرشتے کا جوتا ہے
تم کنھئی چھال کے تنگ موزے میں
اک پیر ڈالے
یہ جوتا پہننے کی کوشش میں لنگڑا رہے . . .
دوسری ٹانگ شاید
کسی عالمی جنگ میں اُڑ گئی ہے

مرا جال خالی
مگر دل مسرت کے احساس سے بھر گیا
تم اسی بانکپن سے
اُسی طرح
گنجی پہاڑی پہ
اپنی ہری وِگ لگائے کھڑے ہو
یہ ہئیت کذائی جو بھائی
تو نزدیک سے دیکھنے آ گیا ہوں

ذرا اپنے پنکھے ہلا دو
مجھے اپنے دامن کی ٹھنڈی ہوا دو
بہت تھک گیا ہوں

موت کی خوشبو

○

جدائی
محبت کے دریائے خوں کی
معاون ندی ہے
وفا
یاد کی شاخِ مرجاں سے
لپٹی ہوئی ہے
دل آرام و عشاق سب

خوف کے دائرے میں کھڑے ہیں
ہواؤں میں بوسوں کی باسی مہک ہے
نگاہوں میں خوابوں کے ٹوٹے ہوئے آئینے ہیں
دلوں کے جزیروں میں
اشکوں کے نیلم چھپے ہیں
رگوں میں کوئی رودِ غم بہہ رہا ہے

مگر درد کے بیج پڑتے رہیں گے
مگر لوگ ملتے بچھڑتے رہیں گے
یہ سب غم پرانے
یہ ملنے بچھڑنے کے موسم پرانے
پرانے غموں سے
نئے غم اُلجھنے چلے ہیں
لبوں پر نئے نیل
دل میں نئے پیچ پڑنے لگے ہیں
غنیم آسمانوں میں
دشمن جہازوں کی سرگوشیاں ہیں
ستاروں کی جلتی ہوئی بستیاں ہیں
اور آنکھوں کے رادار پر
صرف تاریک پرچھائیاں ہیں

ہمیں موت کی تیز خوشبو نے پاگل کیا ہے
امیدوں کی سُرخ آبدوزوں میں سہمے
تباہی کے کالے سمندر میں
بہتے چلے جا رہے ہیں
کراں تا کراں
ایک گاڑھا کسیلا دھواں ہے
زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے

خرگوش کی سرگزشت

○

رقص

شام کھڑی ہے
بھوری جھاڑیوں،
پیلی گھاسوں کے خیموں سے باہر نکلو
نرم ہوائیں بالوں کے جھالرسے گزرتی
لمبے لمبے کانوں میں سرگوشی کرتی ہیں
سُرخ کونپلیں

سبز پتیاں

سانپ چھتریاں . . .
جنگل میں گودام کھلا ہے پاگل
اپنے بیکل نتھنوں میں
اس خوشبو کا چھاپا ڈال کے رقص کرو
ہر خطرے کو چکمہ دو

چور چٹانوں کے نیچے
سو دروازے ہیں
کیسر پھولوں کے بستر ہیں
دھوم مچانے کو سارا میدان پڑا ہے

موت

اور تم اپنے شبستاں چھوڑ کر
اس بیاباں کے اندھیرے راستے پر
خون میں لت پت پڑے ہو
اس کی آخر کیا ضرورت تھی
وہاں پر تم جہاں کے حکمراں تھے
کیا نہیں تھا ؟
خواب کی دیوار کیونکر پار کرنا چاہتے تھے
اس تجسس میں کشش کیسی ہے
نامعلوم کو تسخیر کرنے کی تمنا کس لیے ہے
اس پرانی آرزومندی میں کیا ہے
اس خیاباں کے عقب میں
وہ جو پراسرار دنیائیں بسی ہیں
وہ ہمیں کیوں کھینچتی ہیں ؟

ایک سوّر سے

○

وہ طلسمی دوپہر تھی
سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹّی سے شعاعیں اُگ رہی تھیں
اور تم کرنوں میں اپنے تھوتھنے گاڑے ہوئے
دندناتے پھر رہے تھے

مَیں تمھاری جان کا دشمن
اَنا کے ہش پپّی[1] جوتے پہن کر
اپنے کینے کا نیا کمپا لیے
برتری کے بنچ پر محبوب سا بیٹھا ہوا
اک پرانے جھوٹ سے دامن چھڑانا چاہتا تھا
پھڑپھڑانا چاہتا تھا

مَیں نے دھیرے سے تُمھیں آواز دی . . .
آواز دی تو اپنی ٹیڑھی میڑھی آنکھوں سے
مجھے تم نے عجب عالم میں دیکھا تھا کہ بس
مَیں جی پڑا تھا
میری آنکھیں جگمگا اُٹّھی تھیں
میرے اندر تتلیاں اُڑنے لگی تھیں

اور ملن کی اس گھڑی میں

---

[1] : سوّر کی کھال سے بنے ہوئے جوتے۔ (ساقی)

اس سنہرے دن کے پس منظر میں
تم حیراں سے
اپنی دُھن میں
اپنی جاوداں بڑھوتی میں
ایک چیتے کی طرح سے خوبصورت لگ رہے تھے

ڈرتے ڈرتے
حیرتی رِڈ انڈین امریکیوں کی طرح
دَھرتی کی دھمک سُنتے ہوئے
تم پاس آئے
پاس آکر بے یقینی سے مجھے تکنے لگے تھے
میں تمھیں تسکین دینا ——
—— پھر سے نسل نسی کا رشتہ جوڑ لینا چاہتا تھا
اور اپنے سنگ بستہ ہاتھ سے
جب تمھیں سہلا رہا تھا
اور تمھارے کُھردرے بالوں میں
اپنی انگلیاں اُلجھا رہا تھا
ایک البیلی مسرت اک نئی لذت ملی
وہ جو نفرت کی کمانی دل کی تہہ میں گڑ گئی تھی
ٹوٹتی جاتی تھی
میرے اندر کی کلیں کُھلنے لگی تھیں
میں پگھلتا جا رہا تھا

وہ ہماری دوستی ——،
وہ ہماری فتح مندی کا جنم دن ——،
وہ طلسمی دوپہر ——،
—— سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹی سے شعاعیں اُگ رہی تھیں

شیر امداد علی کا میڈک[1]

○

مگر تنگ نظر
مٹیالے تالاب میں
اُس اَدھ کِھلے کنول پر
وہ بہار تھی

---

[1] میں نے مینڈک سے "ن" کو نکال دیا ہے کہ شاعروں کو اس قسم کی قطع و برید کی آزادی ہے (ساقی)

جو دیکھنے والی آنکھوں میں دھنک کھلاتی ہے
پھر پانی کا بلاوا الگ تھا
اس ساحرانہ کشش سے ہار کر
اپنا تہمد اتار کر
وہ مُردہ پانی میں کود پڑے
جل کُنبھی سے اُلجھے
تو ہفتے عشرے کے حمل کی مانند
نرم اور خام سروں والے
گل گھتھنے
(ضدا کار میڈکوں کے
دُمدار بچّے)
شارک لہروں کے شور
سے ڈر کے
فر فر ہر طرف بھاگ کھڑے ہوئے
اور شیر امداد علی گلے گلے پانی میں تھے
اور کنول دور تھا

بجلی چمکی
اور ایک دُمدار آب خوار
اس غبارے کی سُرعت سے
جس میں ہوا بھری ہو
اور ہاتھ سے چھوٹ جائے
چھپکلی کی تلوار زبان کی طرح
سن سن کرتا ہوا
ان کے کھلے منہ کی سُرنگ میں اتر گیا

دن گزرے
اور موسم بدلے

اور جگ بیت گئے

اک آواز تعاقب کرتی رہتی ہے
"باہر آنے دو
اس زنداں سے باہر آنے دو"
در جنوں
ڈاکٹروں اور سرجنوں کے
ایکسرے کی خنک شعاعوں سے
جل کر دیکھ لیا
شہر بدل کر
ملک بدل کر دیکھ لیا
مگر لہو میں
وہی صدا ہلکورے لیتی ہے
"باہر آنے دو
اس زنداں سے باہر آنے دو۔۔"

شیر امداد علی
پانی کی امانت غصب کیے
اپنے گھر میں زنجیر ہوئے
بیٹھے ہیں
باہر پانی کھڑا ہے
اور پانی میں
پیپل کے پتوں کی طرح
سالے
خشمگیں آنکھوں والے
پیلے پیلے مینڈک
اپنا گھیرا ڈالے
پڑے ہوئے ہیں

شاہ صاحب اینڈ سنز

○

شاہ صاحب خوش نظر تھے
خوش ادا تھے
اور روزی کے اندھیرے راستوں پر
صبر کی ٹوٹی ہوئی چپل پہن کر
اک للک اک طنطنے کے ساتھ سرگرم سفر تھے
اور جینے کے مرض میں مبتلا تھے
جو غذائیں دسترس میں تھیں
عجب بے نور تھیں
ان میں نمو کاری نہ تھی
وہ جو موتی کی سی آب آنکھوں میں تھی
جاتی رہی
پتلیوں میں خون
کائی کی طرح جمنے لگا
رفتہ رفتہ
موتیا بند ان کے دیدوں پر
زمرد کی طرح اترا
عجب پردہ پڑا
سارے زمانے سے حجاب آنے لگا . . .

مضطرب آنکھوں کے ڈھیلے
خشک پتھرائے ہوئے
اتنے بے مصرف کہ بس

اکیانوے

اک سبز دروازے کے پیچھے
بندسیپی کی طرح سے
چھپ کے واویلا کریں
اور اندھیرے آئینہ دکھلائیں استنجا کریں

صرف دشمن روشنی کا انتظار
زندگانی غزوۂ خندق ہوئی
اس قدر دیکھا کہ نابینا ہوئے

. . . اور جب رازق نگاہوں میں
سیاہی کی سلائی پھر گئی
چھتنار آنکھوں سے
تجلّی کی سنہری تِتّیاں گرنے لگیں
تو شاہ صاحب اور بے سایہ ہوئے
اِن کی اندھی منتقم آنکھوں میں دُنیا
ایک قاتل کی طرح سے جم گئی
جیسے مرتے سانپ کی آنکھوں میں
اپنے اجنبی دشمن کا عکس

یوں سراسیمہ ہوئے
یوں ذات کے سنسان صحراؤں میں افسردہ پھرے
جیسے جیتے جاگتے لوگوں کو دیکھا ہی نہ ہو
جو شبیہیں دھیان میں محفوظ تھیں
ان سے رشتہ ہی نہ ہو

جگمگاتی بے قرار آنکھیں
کسی سہمے ہوئے گھونگھے کے ہاتھوں کی طرح
دیکھتی تھیں سونگھتی تھیں لمس کرتی تھیں

وہی جاتی رہیں تو زندگی سے رابطہ جاتا رہا
ہمدمی کا سلسلہ جاتا رہا
وہ جو اک گہرا تعلق
اک اٹوٹ سمبندھ سا
چاروں طرف بکھری کاہوئی چیزوں سے تھا
ہنستے ہوئے روتے ہوئے لوگوں سے تھا
اس طرح ٹوٹا کہ جیسے
شیر کی اک جست سے
زیبرے کی ریڑھ کی ہڈی چٹخ جاتی ہے
برسوں بے طرح بے کل رہے
. . .
. . .

ایک دن آنکھوں میں صحرا جل اٹھا
وہ خیال آیا کہ چہرا جل اُٹھا
اپنے بیٹوں کو کلیجے سے لگایا
جی بھر اٹھا ابر کی مانند روئے
رو چکے تو ایک مہلک آتشیں تیزاب کے
شعلۂ سفاک سے
ان کی فاقہ سنج آنکھوں کو جلایا
اور سجدے میں گرے
جیسے گہری نیند میں ہوں
جیسے اک سکتے میں ہوں

مدتوں سے ان بیاباں راستوں پر
چار اندھے دوستوں کا ایک کورس گونجتا ہے
"اے سخی شہر سخاوت میں گزر اوقات کر
اے نظر والے نظر خیرات کر"

اب اور مکھوٹے نہیں...

(کشور ناہید کی نظمیں)

تعارف:
شمیم حنفی

سترہ نظمیں

○

کشور ناہید!

جین آسٹن!

اُلقاب

ساحلِ مُراد

خود اذیتی

دوسری موت

رات

چوبِ خشک اور آگ

مکافات

التماس

نادرہ کمپلکس

نیلام گھر

ترا لٹیا شہر بھنبھور

جاروب کش

کتنی چاہت والے لوگ ترے دیوانے

اے کاتبِ تقدیر لکھ!

میں کون ہوں

دل کی بات کا سرا دنیا سے جا ملے تو کہنے والا صرف ایک فرد نہیں رہ جاتا، ایک اجتماعی واردات کا علامیہ بن جاتا ہے۔ اس کی ذات خود اس کے لیے بھی ایک مسئلہ ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ یہ آشوب ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتا کہ بے ضرر زندگی بسر کرنے والوں کی مثال بے ضرر باتیں کرنے والے بھی ہر زمانے میں بافراط ملتے ہیں۔ ہستی کے ہنگامے میں ایسے افراد اور الفاظ کی حیثیت سکون کے جزیروں کی ہوتی ہے۔ شکستہ کشتیوں اور راہ سے بھٹکے جہازوں کے مسافر اتفاقاً ادھر آ بھی نکلیں تو بس گھڑی دو گھڑی رک کر یہاں دم لیتے ہیں اور پہلا موقع ہاتھ آتے ہی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کشور ناہید کی شاعری پڑھنے والوں کو نہ سکھ سادھن بہم پہنچاتی ہے، نہ انھیں آسانی کے ساتھ آگے جانے دیتی ہے۔ ایک موجِ مشتعل پاؤں کی زنجیر بن کر پڑھنے والوں کو اُس منڈپ میں کھینچ لے جاتی ہے جہاں ذات اور غیر ذات سب کے سب تجربے کے ایک ہی مرکز پر یکجا نظر آتے ہیں اور فضا ایک مستقل اضطراب، ایک لازوال اندوہ اور ایک ہر لحظہ گہرے ہوتے ہوئے سرکشی کے جذبے سے بوجھل محسوس ہوتی ہے۔

مشرق کی نئی عورت سے میری ایک ملاقات کملا داس کی آپ بیتی میں ہوئی تھی۔ اس کی تجدید ان نظموں اور غزلوں میں ہوئی، اس فرق کے ساتھ کہ کملا داس کی تپسیا نے انجام کار تیاگ میں نروان پایا اور کشور ناہید احساس کی ریاضت کے جس تجربے سے گزر رہی ہے اس کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ شاید آگے بھی یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا کہ کشور نے ذاتی بحران کی حدیں ایک اجتماعی رزمیے سے ملا دی ہیں۔ یوں فنکار ہونے کی مجبوری اسے لفظ کے دائرہ در دائرہ سحر سے نکلنے نہیں دیتی۔ پھر احساس کے بدلتے ہوئے موسموں کے ساتھ جس دھوپ چھاؤں میں اس کے تجربوں کا آواگمن جاری رہتا ہے اس کے گھٹتے بڑھتے سائے اظہار کی سطح کو بھی مرتعش رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ "دیے کی بتی نے چوکھٹ پار کر لی ہے" نہ تو کوئی انجانا بھید ہے، نہ سیدھا سادا من بہلاوا اور نہ صرف اس کا نجی تجربہ۔ ان نظموں کا قاری خود کو بھی اس تجربے کے کسی نہ کسی تماشے میں گھرا ہوا پاتا ہے۔

پہلے پہل میں نے اس کی چند غزلیں پڑھی تھیں تو یہ تاثر لے کر اٹھا تھا کہ نئی شاعری نے پھر ایک فرد سے رسم و راہ قائم کی ہے، ایک ایسے کردار سے جسے ہجوم بے چہرگاں میں دور سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ اُن دنوں اُردو کی شاعرات میں صرف دو نئے نام ——— فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید ایسے دکھائی دیتے تھے جن کی انفرادیت تک رسائی ان کی نسائیت کے حوالے سے ہوتی تھی، جو محض تصور نہ تھے بلکہ جیتے جاگتے انسانی پیکر تھے۔ ان کی شاعری کا یہ پہلو مجھے دو وجہوں سے پسند آیا۔ ایک تو یہ کہ اس سے نئی نظم اور نئی غزل میں اظہار کی ایک نئی جہت نکلتی تھی جس کا سرچشمہ سچائی کا تاثر پیدا کرنے والے شخصی تجربے تھے، دوسرے عام شاعرات کے برعکس یہاں تعارف کا سلسلہ صرف ایک سخن ساز پر ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ یہاں لفظوں کے اجتماع سے ایک حساس عورت کی تصویر بھی ظہور پاتی تھی۔

اب جو ان نظموں اور غزلوں کو پڑھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ کشور ناہید کے بارے میں ابتدائی تاثر کی بنیادیں چاہے نہ بدلی ہوں لیکن ایک نئے بُعد کی شمولیت نے اُسے کچھ مختلف، کچھ اور زیادہ حقیقی ضرور بنا دیا ہے۔ یہ بُعد اس کی تصویر میں چنچتے چھبتے رنگوں کا اضافہ کرتا ہے اور بدلتے ہوئے ذہنی ماحول کے ساتھ ایک نئی آگہی اور ایک نئے جذباتی منظر سے نقاب اُٹھاتا ہے۔ ان اشعار (خاص طور پر نظموں) سے کشور کا جو ہیولیٰ اُبھرتا ہے اسے رسمی لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اب اس کے ہاتھوں میں ایک نیا اعلان نامہ ہے، زندگی کے ایک نئے نظم کی تلاش اور تمنا کا۔ مشرقی عورت کی تقدیر پرستی ———

ہزیمت زدگی اور انفعال سے اسے نفرت ہے۔ حیا یا ایثار کے بہانے اپنے جوہر کے اخفا یا ذات کے زیاں کو قبول کرنے پر وہ آمادہ نہیں۔ اس گرداب سے نکلنے کی جستجو اسے ہلکان رکھتی ہے۔ اور اب وہ ہوا کے وحشی جھونکے کی مانند زنداں سے باہر کھلی فضاؤں میں پرواز کی متمنی ہے۔

یہ خودگرفتگی کشور ناہید کی بصیرت کا آسیب ہے۔ سو وہ شعر میں بھی اپنا اظہار اس طور پر کرتی ہے گویا ایک نیا منشور ترتیب دے رہی ہے۔ مرد اور عورت کے رشتے پر اس طرح کی منطقی سوچ شعر کے جادو میں تخفیف کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ کشور نے اس مسئلے کو یوں حل کرنا چاہا ہے کہ اپنی فکر کو جذبے کی راہ سے احساس تک پہنچا دیا ہے اور یہ فکر اب صرف اس کے ذہن کا نہیں بلکہ پوری ذات کا شناس نامہ ہے۔ مقنعوں کے بغیر زندہ رہنا بھی سہل نہیں ہوتا، شعر کہنا بھی آسان نہیں ہے۔ کشور نے ایک بہت مشکل اور حوصلہ طلب راستے کا انتخاب کیا ہے اور بالعموم اس سے کامراں گزری ہے۔ "مکافات" کے یہ لفظ کہ " میں شاعری کرتی ہوں کیونکہ میں نے خودکشی نہیں کی" اس واقعے کا سراغ دیتے ہیں کہ جب شاعری زندگی کا بہانہ یا اُس کا بدل بن جائے تو ایک ایسی تخلیقی سچائی میں ڈھل جاتی ہے جسے اپنے اظہار کے لیے کسی فریب کی حاجت نہیں رہ جاتی۔

مقنعے اتار دیے جائیں جب بھی ہر چہرے میں ایک ساتھ کئی چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ کشور بھی اُس دوراہے پر کھڑی ہے جہاں مشرقی عورت کا روایتی روپ اور اس کی مٹی سے جنم لینے والا ایک باغی، برہم اور شکستہ پائی کے احساس سے پشیماں کردار ایک دوسرے کا تکملہ بھی ہیں اور باہم متصادم بھی۔ میرا بائی کی طرح محبت کے ہاتھوں ماسوا میں تحلیل ہو جانا اسے قبول نہیں (گرچہ یہ عمل بھی شاید اپنی ہی تلاش کا ہے!) ۔ وہ پرواز کی جویا ہے۔ باہر کے منظروں کا بلاوا اسے درد کی اُس چوکھٹ کو چھوڑنے کی ترغیب دیتا ہے جہاں بیٹھے بیٹھے وہ تھک چکی ہے۔ مگر، اس سے پہلے کہ وہ بند دروازوں سے باہر نکلے، ایک پرچھائیں اسی کے باطن سے نمودار ہوتی ہے اور اُس کھڑکی کو اینٹوں سے چُن دیتی ہے جس پر نئے، انوکھے، پاس بلاتے رنگوں کی یورش ہے۔ نتیجہ کبھی پھڑپھڑاتے ہوئے پروں کا شور، کبھی آشیاں بندی کا سکوت۔ وہ کہ "شبِ ہجر کی تشنگی" ہے اپنی خاکستر اور اپنے شعلے کے ساتھ اُسی موجِ امکاں کی منتظر ہے جس کا سفر طلب اور دریافت کے نقطۂ اتصال پر تمام ہوتا ہے:

جنگل ہے طلب کا اور میں ہوں
کانٹوں میں چھپا گلاب سوچوں

کشور ناہید!
عمر کے اڑتیس برس
تمہارے بالوں اور گالوں میں
اترتی خزاؤں
اور ڈھلتے جذبوں کی آندھیوں میں
کچے ٹوٹتے پھلوں کی طرح
سارے رشتے
زندگی کے چند ن روپوں کی طرح
گدرا گئے ہیں

کشور ناہید!
تم منہ بند سیپی کی طرح
زندگی کے سمندر میں
ہواؤں سے باتیں کرنے
پہاڑوں کی بنیاد ہلانے
اور لہروں کو اپنے بالوں کی طرح کاٹ کر
ساحل پہ
گزشتہ کی روایتی
اور آج کی مضطرب
عورت بن کر سوچ رہی ہو

کشور ناہید!
یہاں نہ کوئی بولتا ہے
نہ کوئی بولتی آنکھوں کے
لفظوں کو سمجھنا چاہتا ہے
ہاتھ سے پھسلتی مچھلی
خود کو نفرت میں بدل دیتی ہے

کشور ناہید!
تمھیں خاموش دیکھنے کی چاہت
قبروں سے بھی امڈی آرہی ہے
مگر تم بولو!
کہ یہاں سننا منع ہے
مجھے جن جذبوں نے خوفزدہ کیا تھا
اب میں ان کے اظہار سے
دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں ◊

جین آسٹن!
تم نے کہا تھا
تم جتنا بھی چاہو
دیوانگی اختیار کرو
مگر دیکھو!
بے ہوش ہو کر، گر مت پڑنا
جین آسٹن!
تم نے یہ اختیار اور جبر کا ترازو
میرے ہاتھ میں کیوں پکڑایا
جین آسٹن!
تمھیں معلوم تھا
تولنے والے کے ہاتھ کانپ جاتے ہیں
تمھیں معلوم تھا
ترازو کے دونوں پلڑے
برابر نظر بھی آئیں
تو اصل میں برابر نہیں ہوتے ہیں
مَیں دونوں پلڑوں کو برابر
ظاہر کر کے، ہانپ گئی ہوں
بیہوشی کے ہوش کے لمحے میں
یہ چند باتیں تم سے
جین آسٹن!
کہ ظاہر میں موجود لوگ
تو سب مر چکے ہیں
میرے لیے!

القاب

○

مَیں تاریکی کی انتہا میں ہوں
اور تم سے مخاطب ہوں
اگر تم میری جانب آؤ تو
اپنی مہربانی کے چراغ ساتھ لانا
مَیں محبتوں کی خوشبو بچا لائی ہوں
اور تمھاری منتظر ہوں

■

ساحلِ مُراد

○

وہ مجھے سُرخ پھولوں کے باغ میں لے آیا
اور میرے بیتاب بالوں کو
سُرخ پھولوں کی تاریکی میں چھپا دیا
اور آخر کار
پھولوں کی پتّیوں کی سُرخی
میرے ساتھ سو گئی

■

خود اذیتی

○

کاش کوئی جھونکا ایسا ہو
میری شکل کی رونق لے کر
میلے، گدلے، اندھے کنوئیں میں پھینک دے جا کے
کاش مری آنکھوں کے تارے
یوں اُلجھیں کہ رات کی تاریکی بھی
ان کے نام سے بھاگے
کاش مرے لہراتے بازو
خوف سے یوں جامد ہو جائیں
جیسے ٹھہرا کندن چمکے
کاش مرے ہونٹوں کی لالی
کالی رات کی دیوی ڈس لے
کاش مری سوچوں کے دھارے
ریت کی صورت
چوس لیں خود اپنی ہی گرمی
کاش مری آنکھوں میں خواب نہ پھیلیں آکر
کاش مجھے احساس کی تصویروں سے
بیزاری ہو ایسی
اپنی نفی پہ ناز مجھے ہو

دوسری موت

○

تم کہتے تھے، میں ہوں نازک پھول کی صورت
جسم مرا پھولوں سے لدی، جھاڑ کی صورت
چال مری ہے بادِ بہاری
آنکھ مری انگور کی پیالی
اور مری باتوں میں اصلی شہد کی خوشبو
اصلی باتیں، سچے جذبے
گہرے پانی
جس کی تہہ میں
ہیرے موتی
جس کی تہہ میں
ریت نہ مٹی
جس کی روانی، شرطِ جوانی

ہر لڑکی ایسی باتوں سے خوش ہوتی ہے
وہ وعدوں کی گرہ میں اُلجھی
عہدِ وفا کی رسّی پکڑے
ٹھنڈے گھر کی چھت کے نیچے
ریت کو پانی کا مس دے کر
گورے بدن کی صورت میں
لمس ملے تو بج اُٹھتی ہے

رات

○

دو بستر،
ایک ہی کمرے۔ ایک ہی چھت کے سائے میں۔
ایک پہ بہتا نیند کا ساگر،
ایک پہ بے خوابی کا صحرا؛
ایک پہ نرم ہوا کے جھونکے،
ایک پہ لُو کے گرم تھپیڑے۔

دو بستر،
ایک پہ تکیے کی آغوش کا گہرا بادل؛
ایک پہ شکنیں، اُمڈے دریا جیسی؛
ایک پہ خواب کی دیوالی اور دہکتے ہونٹ؛
ایک پہ آنکھ کی ویرانی اور سوکھے ہونٹ۔

دو بستر،
ایک پہ کروٹ، دریا ملے سمندر میں؛
ایک پہ کروٹ، نکلے آگ کہ جیسے پتھر میں۔

دو بستر،
بیچ نہ ساحل
اور نہ صحرا ——
پھر بھی ڈونگا لمبا پینڈا۔

چوبِ خشک اور آگ

○

میرے شوق کو میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون
بھلا جانے کون تجھے اور مجھے
پہچانے کون تجھے اور مجھے
پہچان کی منزل کوئی نہیں
کوئی سب کچھ جان کے انجانا
کوئی سب کچھ دیکھ کے بیگانہ
جسموں کی ہئیت تو سب کی ایک سی ہے
اندر بھلا کس نے جھانکا ہے
اندر تو گھور اندھیرا ہے
ہاں سب کا باہر ایک سا ہے
ذرا جھانکو تو
جسموں کے دریچے دیکھو تو
آنکھوں کی پلکیں ایک سی ہیں
آنکھوں کے ڈورے ایک نہیں
بانہیں تو سب کی ایک سی ہیں
بانہوں کا جھولنا ایک نہیں
ہاتھوں کی گرمی ایک نہیں
باتوں کی نرمی ایک نہیں
کبھی تم نے تلوے دیکھے ہیں
کچھ تلوے چاند کے ٹکڑے سے
کچھ تلوے کنکر ذرّے سے
کچھ ہاتھ ملائم روئی سے
کچھ ہاتھ دلدّر مٹی سے
پر دیکھے کون، پہچانے کون
میرے شوق کو میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون!

مکافات

میں شاعری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے خودکشی نہیں کی
میں زندگی کرتی ہوں
کیونکہ میں نے دلبری نہیں کی
میں نوکری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے سروری نہیں کی

میں آگے ہی آگے چلتے رہنا چاہتی ہوں
کیونکہ پیچھے مڑکر ویرانیٔ نقشِ پا دیکھنے کی ہمت نہیں ہے
میں ہنستے ہی ہنستے مرجانا چاہتی ہوں
کیونکہ چہرے کے زخم آلود گڑھوں کو مجسم کرنے کی ہمت نہیں ہے

بیابان ماتھے
خزاں خوردہ آنکھیں
اور سوختہ جاں شوق
کیسے کیسے خزینے ہیں کہ لب کھلتے ہی نہیں
ہوا کا ڈھول گلے میں ڈالو
اور دستکوں سے پوچھو
تم پلٹ کر تو نہیں آؤ گی
بانجھ ہونٹوں سے التفات!
کیا لوگ کاغذ بھی کاتنے لگے ہیں
ساحل اور دریا کا فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے
متوازی لکیروں کا فاصلہ ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے

میں . . .
میں ناگفتنی کرتی ہوں
کیونکہ میں نے گفتنی نہیں کی

التماس

○

دروازوں میں سوراخ کر کے ہم اندر جھانکتے ہیں۔
اندر وحشی ہوا بند ہے۔
ہم اسے بگولوں کی طرح ناچتے دیکھ کر
دروازوں پر لوہے کی سلاخیں گاڑ دیتے ہیں
اور خود اپنی بے بضاعتی چھپانے کے لیے
اپنی فتح کا جشن مناتے ہیں۔
ہم خود اپنے آپ کو تسخیر کر رہے ہیں۔
او کھلی کی طرح خالی سروں،
ٹوٹے فٹ پاتھ کی طرح
ٹیڑھے میڑھے دانتوں
اور خالی بوتلوں کی طرح
پھولے جسموں کی بقا کے لیے
ہم ہوا کا راستہ مسدود کر رہے ہیں۔
ہم مصنوعی دانتوں سے کاٹنے والے
اور مصنوعی بازوؤں کو شمشیر زن سمجھنے والے
ناسٹلجیا کے مریض ہیں۔
ہم راتوں کو خواب میں چلتے ہیں
اور دن کو اعلان کرتے ہیں کہ منزل دُور نہیں۔
سُوکھے ہوئے سیب کی طرح
ہماری تاریخ کی جھرّیاں بھی اب زرد سے خاکستری ہوتی جا رہی ہیں۔
آنکھوں کے حلقوں کی سیاہی رات بن چکی ہے۔
رات ——— کہ ہمارا مقدر نہیں تھی۔
گمرہی ——— کہ ہمارا مقدر نہیں تھی۔
رات اور گمرہی،
ایک ہی کر کے جڑواں بچوں کی طرح
ہماری دھرتی ماں کے پستانوں کو چچوڑ رہے ہیں۔
خدا کے لیے یہ سوراخ بھی بند کر دو
تاکہ ہوا ایک دھماکے کے ساتھ باہر آجائے ——— تازہ ہوا!

○○

ایک سوچ

فادر کمپلکس

○

تمھارے گہرے گھنے چمکتے سفید بالوں میں
میری خواہش کی چاندنی کی اُداس صبحیں
گداز پائیں
میں روٹھ جاؤں تو وہ منائیں
میں جانکنی کا نقاب اوڑھوں
تو دل میں جھانکیں
مجھے منائیں

یہ تیرے بالوں کی صبحِ سادہ
مجھے سکھائے

سفید بادل، زمیں کی پیاسی زباں کی
حدّت مٹا نہ پائیں
تمھاری پیاسوں کی شانت شامیں
جُھلس نہ جائیں

میرے لیے شرطِ جاں عجب ہے
پلٹ کے دیکھوں
تو آگ رونق بنی ہوئی ہے
جو آگے جاؤں
تو بادلوں سے نکلتا سورج
پناہ نہ دے گا
وہ آسماں جو ہمارے کمرے کی کھڑکیوں سے
ہمارے حصّے کا جھانکتا ہے
یہ پوچھتا ہے
تمھاری قسمت کے چاند گھٹنے کے دن
کبھی ختم ہوں تو سوچو
زمیں کی کروٹ میں
زندگی کی خمیدہ دیوار
گر نہ جائے

نیلام گھر

○

موت کا ذائقہ
لفظوں کے پیکر میں
اس کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے
وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر
میرے مُنہ پر نیلے نیلے داغ ڈال کر
یہ جتانا چاہتا ہے
کہ اسے میرے جسم کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے
یہ حق بھی کیسا عجیب ہوتا ہے
حق جتانے کی خواہش
محکومیت کی ڈھال پر اپنا چھتر بناتی ہے
حق جتانے کی خواہش
ہر کذب اور ریاکاری کو
صدقے ہوتی محبتوں کا نقاب اوڑھاتی ہے
مگر نقاب کے نیچے سے چہرہ
اب تو اور بھی صاف، اور بھی واضح نظر آتا ہے
ترغیب اور تذلیل یکجان ہو کر
زوج بنتے ہیں
نفرتوں کی جھیل میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنے سے
ہاتھوں پہ لکھی عزلتوں کی سیاہیاں دھل تو نہیں جاتی ہیں
ہاں مسافتوں کی مایوسیوں کی مٹی
اپنا آپ چھوڑ دیتی ہے
تپے ہوئے تنور سے جس طرح پھولی ہوئی روٹیاں باہر نکلتی ہیں
میرے مُنہ پر طمانچہ مار کر
تمھارے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان
پھولی ہوئی روٹی کی طرح
میرے منہ پر صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں
تم حق والے لوگ ہو
تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے

ترا اُٹیا شہر بھنبھور

○

نیند نہیں آتی ہے۔
بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے۔
میں ستارے گنتے گنتے
یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی
تو تمھیں بار بار گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی خواہشوں سے کہیں کم ہے۔
تم میں بھی خواہش ہے
مجھے خوبصورت بنے رہنے
اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں
لپٹے رہنے کی۔
کیلنڈر کی تصویر بدلتی ہے،
روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی۔

دن،
قدموں کی چاپ کی باز یافت
یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے
واپس آنے کی تسلی کے حرف کی اُمید میں
بسر ہوتا ہے اور یوں
کریز میں سجے دُھلے دُھلائے کپڑوں
کی طرح گزر جاتا ہے۔
اور رات ——

پھر وہی احساس،
پھر وہی خواہش . . .
تب تالے میں چابی گھومتی ہے
—— میں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں،

مرتبان میں بند
تتلی کی طرح۔
صحرا میں گھومتے
اکیلے چیتے کی طرح۔
مگر نیند نہیں آتی ہے . . .

جاروب کش

○

دوسروں کی سیوا
پتھروں کی سیوا کے برابر ہے
بہن، بیوی اور ماں کے رشتوں
کی خاطر جینے والی
تم اپنے لیے بھی تو جیو!
دیکھو، کنول کا پھول
کیسے عالم اور کیسے ماحول میں
اپنی انا اور اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے
تم کیوں آٹھ سال چھوٹے بھائی
کے غصّے بھرے تحکم کو مان کر
کھڑکی سے جھانک کر مسکراتے چہرے
کی تلاش سے آنکھیں چرا لیتی ہو
تم کیوں پینتیس برس کی عمر میں
خود کو سنوارنا بند کر دیتی ہو
کہ تمھیں اپنے شوہر کے زہر میں بُجھے
فقروں سے طلاق کی بُو آتی ہے
کہ تم ماں ہونے کے ناطے
اپنے اندر کے بچّے کو
گوشت پوست کے بچّوں کی بھینٹ چڑھا کر
ممتا کا نام دیتی ہو

جیسے کچے رنگوں کے دھاگے
پانی کے ایک ہی قطرے سے
رنگ چھوڑ دیتے ہیں
یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے کچے دھاگے ہیں
سب پتھر ہیں
ان کے اوپر چلو تو بھی لہولہان
ان کو سہو تو بھی لہولہان
پر اپنے لیے جینا کیوں ممکن نہیں
میری بہنو!
سورج مکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر
گردن گھماتے گھماتے
میری ریڑھ کی ہڈی
چٹخ گئی ہے
جسم کا سارا بوجھ سہنے والی ہڈی
چٹخ گئی ہے

کتنی چاہت والے لوگ ترے دیوانے

۞

تقدیس کے لفظ سے ہاتھ رچا کے
پیروں میں قیدی کی سی بیڑیاں ڈال کے
اسے حیا کا نام دیا ہے
کتنا سندر کتنا پیارا نام دیا ہے
ہیرے کی کنی جیسا
خنجر کی انی جیسا۔ ۔ ۔

وہ کہتے ہیں:
اس سے زیادہ اور تجھے کیا چاہیے گڑیے؟

مرمر جیسی چمکتی صاف بلور دیواریں
تیری حفاظت کی خاطر آراستہ و پیراستہ ہیں
ساگوانی لکڑی کے کالے
دروازے پہ سونے کی زنجیروں میں
دوہرے تالے کی موجودگی یہ تو بتاتی ہے
تیری خاطر، تیری چاہت کی خاطر
کتنے ارمانوں سے سنگھاسن
یہ آدرش سے پیارا گھر
——— جس کے اندر پہلے چیخیں مار کے
یہ بھی دیکھا گیا ہے
کہیں کوئی آواز کسی دراڑ سے باہر جھانکنے کی ہمت
جو کرے تو
ہانپ ہانپ کے جھاگ بنے گی
سلوٹ باہر آ نہ سکے گی

بڑے ارمان سے تیری خاطر
تیری چاہت کی خاطر
یہ گھر یہ سنگھاسن یہ مرمر کی دیواریں
سب کچھ تیری خاطر
تیری چاہت کی خاطر!

▪▪

اے کاتبِ تقدیر لکھ

○

میری جیسی ماں نے جنی تھی
ہیر کہ جس نے زہر پیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
قرۃ العین جو کہلائی
جس نے علم کے سوکھے پیاسے کو تن زیب کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
میرا بائی متواری
جس کے عشق کی گہری پیاس کو
پیمانوں نے لوٹ لیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
نور جہاں غم کی دیوانی
جس کے مزار پہ پھول نہ پتّی
جس نے فراق کا زخم سہا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
قوسِ قزح سی قلوپطرہ
جس کے درد کو لذّت کہہ کے
جب چاہا مطعون کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
نوری، سسّی اور سوہنی
اپنا آپ مٹا کے جنھوں نے
شہرِ وفا آباد کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
لمبی کھجور سی شہزادی
جس کو تیغ کی آنچ نے جھلسا
جس نے جیون وار دیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی
مجھ جیسی بھی کوکھ جلی
قطرہ قطرہ زندہ رہ کر
جس نے موت کو مار دیا

میں کون ہوں

○

موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

مَیں تو وہی ہوں جس کو تم دیواروں میں چن کے
مثلِ صبا بے خوف ہوئے
یہ نہیں جانا
پتھر سے آواز کبھی بھی دب نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں رسم و رواج کے بوجھ تلے
جسے تم نے چھپایا
یہ نہیں جانا
روشنی گھور اندھیروں سے کبھی ڈر نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں گود سے جس کی پھول چنے
انگارے اور کانٹے ڈالے
یہ نہیں جانا
زنجیروں سے پھول کی خوشبو چھپ نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں میری حیا کے نام پہ تم نے
مجھ کو خریدا مجھ کو بیچا
یہ نہیں جانا
کچے گھڑے پر تیر کے سوہنی مر نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں جس کو تم نے ڈولی بٹھا کے
اپنے سر سے بوجھ اتارا
یہ نہیں جانا
ذہن غلام اگر ہے تو قوم ابھر نہیں سکتی

پہلے تم نے میری شرم و حیا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
میری ممتا میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
اب گودوں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے

پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں ◘◘

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی